تعلیم و تربیت

2010

ستمبر
2010

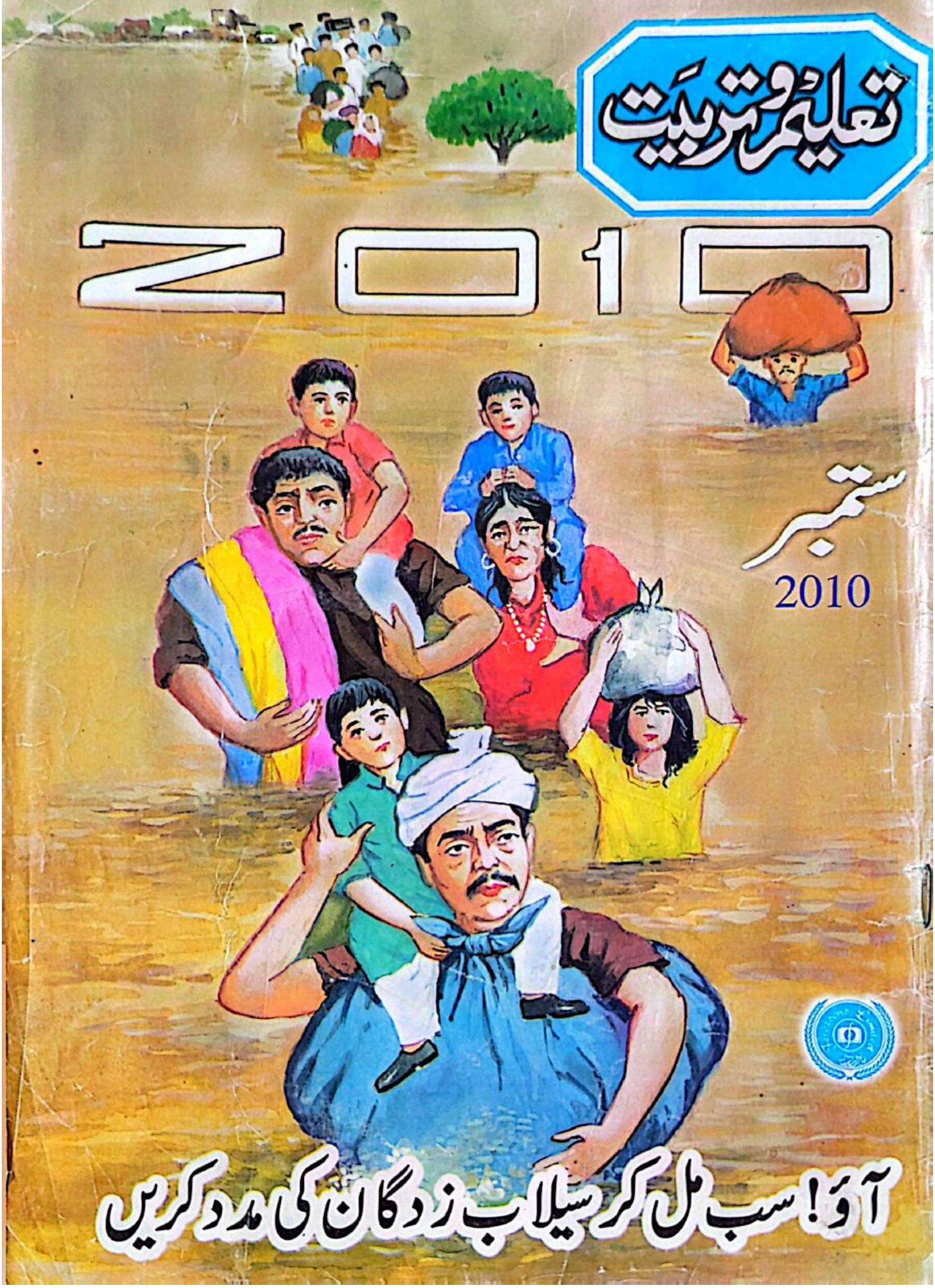

آؤ! سب مل کر سیلاب زدگان کی مدد کریں

دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں

پیارے بچوں کے لیے پیاری پیاری کہانیاں

ہدایات برائے آرڈرز:

- پنجاب: 60 شاہراہ قائدِ اعظمؒ، لاہور 042-111-626262
- سندھ اور بلوچستان: پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی 35830467 - 021-35867239
- خیبر پختونخوا، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے: 277 پشاور روڈ، راول پنڈی 5124897 - 051-5124970

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ہمارے شوروم میں آپ کے لیے انتہائی دیدہ زیب اور معیاری کتابیں دستیاب ہیں

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

70 واں سال پانچواں شمارہ

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

ستمبر 2010ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
درسِ قرآن وحدیث	سید مقبول حسین شاہ	2
عیدالفطر کا پیغام	حفیظ الرحمٰن احسن	3
میجر عزیز بھٹی شہیدؒ	ضیاء الحسن ضیاء	4
رحمت کا فرشتہ	حسن ذکی کاظمی	5
ایم ایم عالم	رانا محمد شاہد	10
نیا جوڑا	راشد علی	11
انوکھا مقبرہ	ظہور الدین بٹ	14
سلوک	علی اکمل تصور	19
میرے پسندیدہ اشعار	باذوق قارئین	24
چچا تیز گام نے افطاری	محمد نعیم عالم	25
مفید مشغلے	غلام حسین میمن	29
شیری اچھا بچہ ہے	ناصر ملک	32
بکری کی سہیلی	ذیشان بن صفدر	33
بچوں کا انسائیکلو پیڈیا	طارق ریاض خان	36
غیبی مدد	کاشف ضیائی	38
مرلی دھرن	ذیشان قریشی	40
دُھوپ کے بعد	عظمیٰ تسنیم	43
آپ بھی لکھئے	ہونہار ادیب	48
خوشیوں کا تہوار	نسرین شاہین	51
پُر خلوص تحفہ	فرحت طاہر	52
چاند	احمد شفیق	54
آپ کا خط ملا	ننھے قارئین	55
میری زندگی کے---	پُر عزم قارئین	57
ایک تھی بھوری	نذیر انبالوی	58
ہونہار مصور	ننھے مصور	63
بلا عنوان	ننھے خوشہ چیں	64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: "سیلاب زدگان"

قیمت فی پرچہ 25 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔

ساتھیو! عید کی مبارک ساعتیں قریب تر ہیں۔ اِس مرتبہ عید الفطر اس موقع پر آئی ہے جب وطنِ عزیز اپنی تاریخ کے بدترین سیلاب سے دوچار ہے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق 2004ء میں بحیرۂ ہند میں آنے والے سونامی سے 50لاکھ افراد، 2005ء میں پاکستان میں ہولناک زلزلے سے 30لاکھ افراد جب کہ حالیہ سیلاب سے اب تک تقریباً دو کروڑ افراد متاثر ہو چکے ہیں۔ سیلابی پانی سے کھڑی فصلیں تباہ، لاکھوں گھر ملیا میٹ، مال مویشی، سڑکیں اور پل بہہ گئے ہیں۔ سیلاب سے ابتدائی اندازے کے مطابق تقریباً پانچ کھرب روپے کا نقصان ہوا ہے۔ سیلاب سے سب سے زیادہ عورتیں اور بچے متاثر ہوئے ہیں۔ ریلیف کیمپوں میں مقیم بچے مختلف وبائی امراض کا شکار ہو رہے ہیں اور انہیں غذائی اشیاء کی قلت کا بھی سامنا ہے۔ ہنستے بستے گھروں میں بسنے والے لوگ اِس مرتبہ ریلیف کیمپوں میں عید کا چاند دیکھیں گے۔

مصیبت کی اِس گھڑی میں جہاں بہت سے ادارے سیلاب زدگان کی مدد کے لیے سرگرمِ عمل ہیں وہاں انفرادی حیثیت سے ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم عید سادگی سے منائیں اور سیلاب سے متاثرہ بھائی بہنوں کی دل کھول کر مدد کریں۔ سیلاب زدگان ہماری مدد کے منتظر ہیں۔ دیر مت کریں، عید کی خوشیوں میں سیلاب زدگان کو بھی شامل کریں۔

"آزادی نمبر" کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ہماری طرف سے تمام قارئین کو عیدالفطر کی مبارک ہو۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں

فی امان اللہ (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر خاص	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبدالسلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سید مقبول حسین شاہ	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بینکی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایبر پریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361310-36361309 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔

ایشیاء، افریکا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1250 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایبر پریس روڈ، لاہور
UAN: 042 - 111 62 62 62 Fax: 042 - 6278816
Email: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

CamScanner

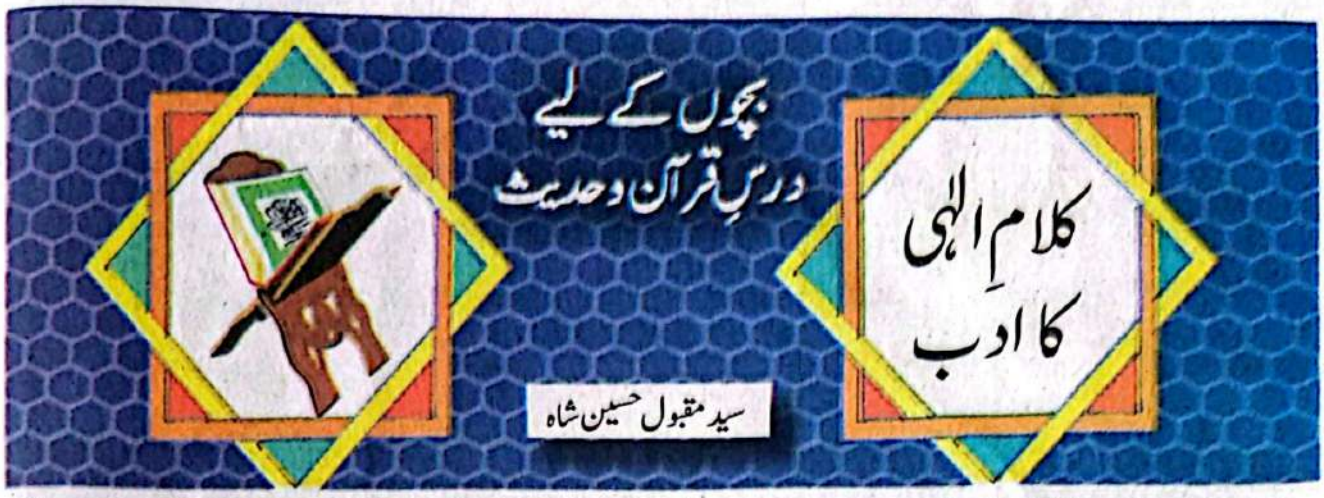

ہمارا دین "اسلام" ہمیں اَدب کا درس دیتا ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم بڑوں اور بزرگوں کا اَدب کریں۔ ماں باپ کا اَدب کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جب آپ کے ماں باپ بڑھاپے کو پہنچ جائیں اور آپ اُن کے سامنے جائیں تو اَدب سے کندھے جُھکا کر جائیں۔ اِسی طرح اُستاد، جن سے ہم علم کی روشنی حاصل کرتے ہیں، اُن کا اَدب ضروری ہے۔ ہمارے لئے سب سے زیادہ واجب الاحترام ہستی اللہ تعالیٰ کی ہے جو ہمارا خالق، ہمارا مالک اور ہمارا پروردگار ہے، جس نے ہماری راہنمائی کے لئے نبی اور پیغمبر مبعوث فرمائے اور قرآن مجید نازل فرمایا جو انتہائی پاکیزہ کلام ہے اور ہمارے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کا جتنا بھی اَدب کریں کم ہے۔ اِسی طرح مسجد، جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے اور جہاں ہم سب مل کر نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں، نہایت اَدب کی جگہ ہے۔ صحیح حدیث میں ہے۔

رسولِ کریمؐ نے فرمایا: "جو شخص لہسن پیاز کھائے، اُسے چاہیے کہ ہماری مسجد سے دُور رہے اور اپنے گھر میں بیٹھے۔"

(صحیح بخاری! صحیح مسلم)

مسجد میں خوشبو لگا کر جانا پسندیدہ عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ کے پاک ناموں کو لیتے وقت منہ سے ناپسندیدہ بو نہیں آنی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

سورۂ حج آیت ۳۲: اور جو کوئی اللہ سے منسوب چیزوں کا اَدب کرے تو یہ دل کی پرہیزگاری ہے۔"

اگر کوئی شخص کسی دُور دراز علاقے میں ہو اور اُس کو اُس کی ماں کا خط ملے تو وہ بڑی عقیدت اور محبت سے اُسے چوم لیتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت ہے۔ ایسی محبت کرنے والی ہستی پر تو ہماری جان بھی قربان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کا ہم جتنا بھی اَدب کریں کم ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں ایک تاریخی واقعہ بیان کیا ہے:

فرماتے ہیں کہ حضرت بشر بن حارثؒ ابتدا میں شراب پیتے تھے۔ ایک روز آپ نشے کی حالت میں مست جا رہے ہیں کہ راستے میں ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا جس پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا ہوا تھا۔ آپ نے اُس پرزے کو بڑے اَدب سے اٹھایا اور بڑی محبت سے اُس کو صاف کر کے اُس پر خوشبو لگائی، اُسے چوما اور ایک پاک جگہ پر رکھ دیا۔ اُسی رات انہوں نے خواب میں دیکھا، اُن کو اللہ تعالیٰ کی آواز آئی: "اے میرے پیارے بندے، تُو نے میرے نام کو خوشبو لگائی۔ مجھے اپنی عزت کی قسم میں تیرے نام کو دُنیا اور آخرت میں خوشبوؤں سے بساؤں گا۔ تیرا نام جو شخص بھی سنے گا اُس کے دل اور جان کو راحت نصیب ہوگی۔" جب آنکھ کھلی تو آپ کے دل کی کیفیت بدل چکی تھی۔ دُنیاوی خواہشات کی جگہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت موجزن تھی۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ آپ جوتا پہن کر زمین پر نہیں چلتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ میں اللہ تعالیٰ کی زمین پر جوتا کیسے رکھوں۔ آپ ہر وقت باوضو رہتے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ کا نام بغیر وضو نہ لیں۔

آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے نام اور کلام کا اَدب کرنے سے ایک گنہگار شخص کی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب آگیا۔ اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا جیسا کہ اِس وقت ہم اُن کا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کا دل وجان سے اَدب کریں تاکہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو، ہماری راہنمائی کرے اور ہم دُنیا اور آخرت کی نعمتوں سے سرفراز ہوں۔ آمین۔

عیدالفطر کا پیغام

بجا لائیں خدا کا شکر ، عید الفطر کا دن ہے
خوشی سے جگمگاتا اور جیتا جاگتا دن ہے
رکھے روزے تو دن گزرے سبھی رَب کی اِطاعت میں
گزاری ہیں یہ راتیں بھی ، تلاوت میں ، عبادت میں
خدا کا شکر ، توفیقِ عبادت اُس نے بخشی ہے
دکھایا راستہ سیدھا ، ہدایت بھی عطا کی ہے
یہ عید الفطر ہے تُحفہ حسیں ، ماہِ مبارک کا
وہی ماہِ مبارک جس میں قرآنِ عظیم اُترا
بنیں "مسلم" ..... تقاضا ہے یہ قرآں کی محبت کا
یہی کردار ہونا چاہیے پاکیزہ اُمت کا
ہمیں شامل کیا اپنے نبیؐ کی پاک اُمت میں
ہے سب سے اُونچا جن کا مرتبہ بزمِ نُبوت میں
وہ نیکی کے سبق سارے جو سیکھے ، یاد ہم رکھیں
دلوں کو بندگی کے نُور سے آباد ہم رکھیں !
یہ عید الفطر کا پیغام ہے ، دل میں بسا لیں ہم !
خدا کے دینِ برحق کو نظام اپنا بنالیں ہم !

حسین اخلاق سے یہ زندگی اپنی سجا لیں ہم
ہر آنے والے دن کو اِک "تحفہ" بنا لیں ہم !

حفیظ الرحمٰن احسن (لاہور)

میجر عزیز بھٹی شہید

پیارے میجر عزیز بھٹی شہید
چرچا ہر سُو ہے تیری جرأت کا
تجھ کو تمغہ ملا شہادت کا
ہم نہ بھولیں گے اے عزیزِ وطن
پیارے میجر عزیز بھٹی شہید

مورچے پر ڈٹا رہا ایسا
اپنے دشمن کو کر دیا پسپا
زندہ تاریخ میں ہے تیرا چلن
پیارے میجر عزیز بھٹی شہید

نہ رہا تُو نماز سے غافل
مل گئی تجھ کو عشق کی منزل
تجھ سے خائف رہا ترا دشمن
پیارے میجر عزیز بھٹی شہید

جان دے کر بچایا مُلک اپنا
ہُوا پورا جہاد کا منشا
تیرے خوں سے مہک اُٹھا گلشن
پیارے میجر عزیز بھٹی شہید

منشا: مقصد

ضیاء الحسن ضیاء، کراچی

رحمت کا فرشتہ

حسن ذکی کاظمی (لاہور)

سوتے سوتے ہاشم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے ماں سے پوچھا:

"اماں! ابا نہیں آئے؟" ماں نے افسردہ لہجے میں جواب دیا "نہیں بیٹا! ابھی تک نہیں آئے۔"

منی آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ ماں اور بھائی کی باتیں سنیں تو وہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی:

"اماں! چاند تو نظر آگیا ہے نا؟"

ماں نے کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کہا:

"ہاں بیٹی! کمیٹی والوں نے اعلان کردیا ہے۔ آج آخری روزہ تھا۔ کل عید ہو گی۔ چلو اب تم دونوں سو جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ ہاشم کو نماز کے لئے بھی جانا ہے۔"

ہاشم نے پھر سوال کیا:

"اماں! ابا کب آئیں گے؟ آپ تو کہتی تھیں عید سے کئی دن پہلے آجائیں گے۔ اب تو عید بھی آگئی مگر ابا نہیں آئے۔"

حمیدہ نے استری ایک طرف رکھ دی اور کچھ کہے بغیر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور بچوں کی طرف دیکھا۔ اُس کا بچوں کی طرف دیکھنا تھا کہ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ دونوں بچے سہم کر ماں سے لپٹ گئے۔

"اماں! کیا ہو گیا آپ کو؟ کیا ہو گیا ابا کو؟" منی نے رونے میں اماں کا ساتھ دیتے ہوئے پوچھا۔

حمیدہ نے پھر اپنے آنسو پونچھے اور جلدی سے بولی:

"کچھ نہیں ہوا بیٹی! سب خیریت ہے۔ تیرا ابا بھی بالکل ٹھیک ہے۔ بس بات یہ ہے کہ وہ ابھی آ نہیں سکتا۔"

ہاشم نے رنجیدہ ہو کر کہا:

"اماں آپ تو کہہ رہی تھیں کہ ابا کی سزا ختم ہو گئی اور انھیں عید سے پہلے رہا کر دیا جائے گا۔ اب آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ نہیں آ سکیں گے۔ کیا بات ہو گئی اب؟ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سزا ختم ہونے کے بعد بھی جیل والے میرے ابا کو بند رکھیں۔"

منی نے بھی اپنی آنکھیں قمیص کے دامن سے صاف کیں اور کہنے لگی:

"بھیا! میرا تو خیال ہے کہ اماں ہمیں جھوٹی تسلی دے رہی تھیں۔"

حمیدہ نے منی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"نہیں میری جان۔ میں جھوٹی تسلی نہیں دے رہی تھی..... میں نے سچ بتایا تھا کہ تمہارے ابا کی سزا کی مدت ختم ہو چکی ہے، لیکن مجھے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ عدالت نے سزا کے ساتھ بیس ہزار روپے جرمانہ بھی عائد کیا تھا۔ اور اگر یہ جرمانہ ادا نہ کیا گیا تو پھر چھے مہینے کی سزا مزید بھگتنا پڑے گی۔ اب تم بتاؤ کہ میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟ میرا کوئی ایسا زیور بھی نہیں۔ گھر میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں جسے بیچ کر یہ جرمانہ بھر دوں۔ بس صبر کرو میرے بچو۔ جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں چھے مہینے اور سہی، اچھا شاباش اب سو جاؤ۔"

ہاشم نے بڑی بے چارگی سے کہا:

"اماں اب نیند کیسے آئے گی۔ آپ نے تو اتنی بُری خبر سنادی۔ میں اور منی تو بالکل چھوٹے چھوٹے تھے جب ابا گئے ہیں۔ اتنے سال گزر گئے ابا کے بغیر عید مناتے۔ ہم خوش تھے کہ ابا کے ساتھ عید منائیں گے۔ اب آپ کہہ رہی ہیں کہ چھے مہینے اور لگیں گے۔ پتا نہیں چھے مہینے بعد بھی ابا آئیں گے یا نہیں، کون جانے؟"

حمیدہ نے بیٹے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی:

"نہیں، نہیں بیٹے چاند رات کو ایسی منحوس بات نہیں کہتے۔ کیوں نہیں آئیں گے؟ ضرور آئیں گے۔ بس تھوڑے دن کی بات ہے۔ بس سو جاؤ۔ میں نے کپڑے استری کر دیئے ہیں۔ صبح اٹھنا اور نہا دھو کر عید گاہ جانا۔"

"پھر وہی شلوار کرتہ استری کر دیا ہو گا نیلا والا، میں وہ نہیں پہنوں گا۔ مجھے چھوٹا ہو گیا ہے اور کئی جگہ سے اس کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا ہے۔ آپ ہر عید پر مجھے وہ پہنا دیتی ہیں..... میں اب کیسے نماز پڑھنے جاؤں گا۔ ویسے بھی میں کیوں جاؤں نماز پڑھنے جب اللہ تعالیٰ نے میرے ابا کو گھر نہیں بھیجا۔"

حمیدہ نے ہاشم کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"نہیں بیٹے ایسے نہیں کہتے..... تم تو سمجھ دار بچے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے مہربان ہیں۔ اس عید پر نہ سہی وہ اگلی عید پر تمہارے ابا کو ضرور بھیجیں گے اور پھر تم دونوں کے نئے کپڑے بھی آئیں گے، کھلونے بھی آئیں گے اور مٹھائی بھی آئے گی۔"

منی منہ بسور کے بولی:

"بس رہنے دو اماں۔ آپ تو ہمیشہ تسلی ہی دیتی ہیں، آؤ بھیا سو جاؤ شاید خواب میں دکھائی دے کہ ابا آگئے ہیں۔ ہمارے لئے نئے کپڑے اور کھلونے لائے ہیں اور ہم خوشی خوشی عید منا رہے ہیں۔"

ہاشم نے بے زاری سے کہا:

"ہونہ ہو..... بلی کے خواب میں چھچھڑے..... نئے کپڑے..... نئے کھلونے..... مٹھائیاں..... ندیدی کہیں کی۔"

منی نے احتجاج کیا:

"دیکھو! اماں یہ بھیا چاند رات کو بھی لڑائی کر رہے ہیں..... انھیں منع کریں، میری مرضی ہے میں جو چاہے خواب دیکھوں۔ انھیں کیا..... وہ فریدہ کی باجی بتا رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ پہلے اچھے اچھے خواب دکھاتے ہیں نیک بندوں کو اور پھر ان کی اچھی تعبیر مل جاتی ہے یعنی وہ خواب سچے ہو جاتے ہیں۔"

ہاشم کو ہنسی آگئی۔ وہ بولا:

"واہ بھئی واہ، تیری سہیلی کی باجی تو بڑی پہنچی ہوئی ہیں۔ لوگوں کے خواب سچے کرا رہی ہیں۔ واہ میری منی واہ..... ارے پگلی..... جب اللہ تعالیٰ کو دینا ہی ہے تو وہ خواب کیوں دکھائیں گے.....؟ وہ تو دُنیا کے مالک ہیں جسے جو چاہیں دیں، جب چاہیں دیں، واہ بھئی یہ خواب والی بات خوب رہی..... اچھا چلو اب سو جاؤ۔ مجھے جلدی اٹھنا ہے۔"

حمیدہ بھی بستر پر لیٹ گئی اور اُس کے دماغ میں خیالوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔

پانچ سال پہلے ملک نذیر نے اس کے شوہر امداد علی کو بلا کر یہ اصرار کیا کہ وہ اپنی نہر والی زمین اُن کے ہاتھ بھیج دے۔ امداد علی نے انکار کیا تو ملک صاحب ناراض ہو گئے۔ بات بڑھ گئی۔ امداد علی نہر کا پانی چرانے اور جانور چوری کرنے کے الزام

میں پکڑا گیا۔ مقدمہ چلا۔ چار سال قید اور بیس ہزار جرمانے کی سزا ہوئی۔ ساری بستی جانتی اور مانتی تھی کہ امداد علی نیک اور ایمان دار ہے۔ اس پر جھوٹا مقدمہ ہے لیکن کس میں ہمت تھی کہ امداد علی کے حق میں گواہی دیتا۔ اُس کے خلاف گواہی دینے والے بہت تھے۔ یہ چار سال حمیدہ اور بچوں نے انتہائی غریبی اور لاچارگی میں گزارے۔ حمیدہ نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ بچوں کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ انھیں روکھی سوکھی کھلا کر اُن کا پیٹ بھی بھرتی رہی اور موٹے جھوٹے کپڑے سے اُن کا تن بھی ڈھانپتی رہی۔ چار سال کا عرصہ ایک ایک دن گن کے گزارا۔ دنوں کی یہ گنتی پوری ہونے کو آئی تو پتہ چلا کہ چھے مہینے اور انتظار کرنا ہو گا کیونکہ جرمانے کی رقم بھرنا تو ناممکن تھا۔

بیس ہزار کی رقم..... وہ سوچنے لگی کاش کوئی بیس ہزار روپے دے دیتا..... پھر وہ بڑبڑائی:

"بیس ہزار روپے مجھے کون دے گا۔" پھر ایک ایک کر اُسے وہ کہانیاں یاد آئیں جو اُس نے بچپن میں سنی تھیں اور اب کبھی کبھی بچوں کو سناتی تھی۔

وہ لکڑہارے کی کہانی..... لکڑہارا جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر زمین پر گری تو ٹن سے آواز آئی۔ اُس نے اُس جگہ زمین کھودی تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں خزانہ دفن ہے..... پھر حمیدہ کو دُوسری کہانی یاد آئی..... ایک آدمی کو مرغی مل گئی جو روز سونے کا ایک انڈا دیتی تھی۔ وہ سوچنے لگی..... دو انڈے بھی مل جائیں تو کام بن جائے گا۔ اور اُس کے دماغ میں ایک یہ خیال بھی آیا کہ بوتل والا جن اگر یہ سوال کرے کہ میرے لائق کیا خدمت ہے تو یہ مسئلہ پلک جھپکتے حل ہو جائے گا۔ بھلا جن کے لئے بیس ہزار کی کیا حقیقت ہے۔ سوچ کا یہ سلسلہ ایک دم رک گیا اور اسے اپنی حماقت پر ہنسی آگئی۔ وہ شرمندہ ہو کر اپنے آپ سے کہنے لگی:

"حمیدہ تُو تو بالکل بچہ بن گئی۔"

یہ کہہ کر اُس نے کروٹ لی اور بچوں پر نظر ڈالی۔ دونوں بچے سو رہے تھے۔ یوں لگا جیسے منی کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ ہے۔ جیسے وہ خواب میں اپنے ابا سے ملاقات کر رہی ہے اور اُن کے لائے ہوئے تحفے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ پھر اُس کی نظر ہاشم پر پڑی اور اس کے یہ جملے کان میں گونجنے لگے۔

"ارے پگلی! جب اللہ تعالیٰ کو دینا ہی ہے تو وہ خواب کیوں دکھائیں گے؟ وہ تو دُنیا کے مالک ہیں..... جسے چاہیں دیں..... جب چاہیں دیں۔"

حمیدہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی اور اُس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر اچانک دستک سنائی دی۔ حمیدہ کچھ ڈر سی گئی۔

"میرے اللہ خیر، اتنی رات گئے کون آگیا؟"

یہ کہہ کر وہ بستر سے اٹھی۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ حمیدہ نے دروازے کے سوراخ پر لگا ہوا ٹین کا ڈھکن سرکا کر گلی میں جھانکا۔ بجلی کی ہلکی ہلکی روشنی میں اُسے باہر کوئی کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ حمیدہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُس نے منہ دروازے کے سوراخ کے پاس لے جا کر کہا۔

"ہاشم کے ابا تم!!!" جواب ملا:

"حمیدہ! میں آگیا ہوں، دروازہ کھولو۔"

امداد علی نے اندر آ کر وہ بیگ جو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا ایک کونے میں رکھے اور لپک کر بچوں کے بستروں کے پاس گیا۔ اُس نے بے اختیار ہاشم اور منی کو چومنا شروع کیا۔ ذرا دیر میں دونوں بچے جاگ گئے اور گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ منی نے باپ کو دیکھا اور آنکھیں ملتی ہوئی بولی:

"بھیا! میرا خواب شروع ہو گیا..... ایسا لگ رہا ہے جیسے ابا آگئے ہوں، وہ دیکھو....."

ہاشم نے باپ سے لپٹتے ہوئے کہا:

"اری پگلی! یہ خواب والے نہیں..... ہمارے سچ مچ کے ابا ہیں..... لے تُو بھی ہاتھ لگا کر دیکھ لے۔"

یہ کہہ کر ہاشم نے بہن کا ہاتھ پکڑا اور ابا کے ماتھے اور

گالوں پر لگایا۔ منی خوشی سے اچھل پڑی اور باپ سے چمٹ گئی۔ تھوڑی دیر تو رونا دھونا ہوتا رہا۔ پھر منی نے بے تاب ہو کر پوچھ ہی لیا:

"ابا! کیا آپ ہمارے لئے عید کا جوڑا اور کھلونے لائے ہیں؟"

امداد علی نے جواب دیا: "لو وہ کیسے نہ لاتا۔ تمہارے تحفے خریدنے میں ہی تو اتنی دیر ہوئی ہے، بڑی بھیڑ تھی بازار میں۔ اور پھر شہر سے یہاں تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ بسوں میں جگہ ہی نہیں مل رہی تھی۔"

امداد علی نے پلاسٹک کے تھیلوں سے بیوی اور بچوں کے کپڑے، چوڑیاں اور دُوسری چیزیں نکال کر بستر پر ڈھیر لگاتے ہوئے پوچھا:

"پر یہ بتاؤ حمیدہ کہ تم لوگ مجھے لینے کیوں نہیں آئے؟ اور یہ جرمانے کی رقم کا بندوبست کیسے ہوا؟"

حمیدہ نے حیرت سے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی:

"مجھے کیا معلوم..... یہ تو تم بتاؤ۔"

امداد علی ہنسا اور کہنے لگا:

"لے دیوانوں کی سی باتیں شروع کر دیں۔ میں کیا بتاؤں۔ مجھے تو تین بجے جیل سپرنٹنڈنٹ صاحب نے بلا کر کہا کہ جرمانے کی رقم سرکاری خزانے میں جمع ہو گئی ہے اور مجھے انہوں نے رہا کر دیا۔ چلتے وقت ایک لفافہ دیا جس میں دو ہزار روپے تھے اور کہا کہ یہ پیسے بھی تمہارے لئے آئے ہیں کہ بچوں کے لئے عید کے کپڑے اور جوتے لے جانا۔ بس اتنی بات ہوئی۔ بس جی میں تو خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اور کچھ نہیں پوچھا اور وہاں سے چل پڑا۔"

امداد علی، حمیدہ اور دونوں بچے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ حمیدہ بولی:

"ہاشم کے ابا یہ کیا ماجرا ہے؟ اس بستی میں کون ہمارا ایسا ہم درد نکل آیا جس نے بیس ہزار جرمانہ بھرا اور اُوپر سے دو ہزار کپڑوں اور جوتوں کے بھی دے دیئے..... اور پھر نام پتہ کچھ نہ بتایا..... ارے ہاں ہاشم کے ابا مجھے ایک بات بتانی ہے تمہیں..... ایسا ہے کہ پچھلی دو عیدوں کے موقع پر کوئی گھر کے دروازے میں سے ایک لفافہ ڈال جاتا تھا۔ اس پر لکھا ہوتا تھا "بچوں کی عیدی" خاصی رقم ہوتی تھی اُن میں..... مجھے اچھا تو نہیں لگتا تھا، لیکن کیا کرتی۔ ہاتھ بہت تنگ تھا لہٰذا میں وہ پیسے خرچ کر لیتی تھی، بہت سے کام نکل گئے اُس رقم سے۔"

امداد علی اور بھی حیران ہوا..... وہ اور بیوی بچے دیر تک سوچتے رہے، لیکن گتھی نہ سلجھی..... آخر میں منی بولی:

"وہ فریدہ کی باجی بتا رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ دیتے ہیں تو چھپڑ پھاڑ کر دیتے ہیں..... مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ روپے کسی آدمی نے

نہیں دیئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے چھپڑ پھاڑ کر دیئے ہیں۔"

منی کی یہ بات سن کر سب ہنس پڑے۔

کچھ دیر بعد فجر کی اذان سن کر امداد علی یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا:

"اچھا بچو! اب سب مل کر اللہ کو یاد کرو اور اس کا شکر ادا کرو جس نے ہمیں یہ موقعہ دیا کہ ہم سب مل کر عید کی خوشیاں منائیں۔"

اور واقعی ان چاروں نے عید اِس طرح منائی کہ کوئی کیا منائے گا۔ چار عیدوں کے بعد ایسی عید آئی تھی جب امداد علی اور اُس کے بیوی بچوں کو کوئی غم نہ تھا، کوئی فکر نہ تھی، کوئی ڈر نہ تھا۔ بس ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی۔

امداد علی کو یہ بات تو حمیدہ سے جیل ہی میں پتہ چل گئی تھی کہ دو سال پہلے ملک نذیر دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے تھے اور اُن کی جگہ اُن کا اکلوتا بیٹا ملک شبیر جائیداد کا مالک تھا لیکن یہ بات کسی کو پتہ نہ تھی کہ ملک شبیر کو ایک سال پہلے ڈاکٹروں نے معدے کا سرطان تشخیص کیا تھا۔

عید کے تین دن بعد امداد علی ملک شبیر کے پاس بڑے ملک صاحب کے افسوس کے لئے گیا تو ملک شبیر حیران بھی ہوئے اور کچھ شرمندہ بھی۔ انہوں نے کہا:

"یار امداد علی! میری تو ہمت نہیں پڑ رہی کہ تم سے آنکھیں ملاؤں۔ بابا نے جو کیا اچھا نہیں کیا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ بابا کے سامنے بولنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ یار مجھے معاف کر دینا..... اور ہو سکے تو بابا کو بھی۔"

امداد علی فوراً بول پڑا:

"چھوٹے ملک صاحب! اس بات کو بھلا دیں مرنے والے کی بس اچھی باتیں یاد کرنی چاہیں۔ آیئے بڑے ملک صاحب کی مغفرت کی دُعا کریں۔"

یہ کہہ کر اُس نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ دُعا ختم ہوئی تو ملک شبیر پھر بولے:

"یار امداد علی! میرے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ یار چند گھر والوں کے سوا کسی کو پتہ نہیں کہ میں کینسر کا مریض ہوں اور تھوڑے دنوں کا مہمان ہوں، اللہ نے بڑا کرم کیا کہ تم آگئے اور مجھے تم سے معافی مانگنے کا موقع مل گیا۔"

اتنا کہا کہ ملک شبیر اپنے آنسو ضبط کرنے لگے اور انھوں نے اٹھ کر امداد علی کو گلے سے لگا لیا۔

امداد علی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اُس نے ملک شبیر کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا:

"ملک صاحب! آپ نے تو مجھ سے ایک بات چھپائی، لیکن وحید ڈرائیور میرا یار ہے۔ مجھے اس سے ساری بات معلوم ہو گئی ہے۔ آپ خاموشی سے میرے بچوں کی مدد بھی کرتے رہے اور آپ نے بیس ہزار روپے کا جرمانہ بھی ادا کیا ہے، آپ تو رحمت کا فرشتہ ہیں۔ اس گنہگار بندے کی یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔"

یہ کہہ کر امداد علی گھر لوٹ آیا..... وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا اور دیکھتے دیکھتے پانچ سال گزر گئے۔ اپنے محسن کے لئے امداد علی کے دل سے جینے کی دُعا ایسی مبارک گھڑی میں نکلی تھی کہ ملک شبیر زندہ ہیں اور ڈاکٹر اُن کی حالت خطرے سے باہر بتاتے ہیں۔

بچو! یہ کہانی تو ختم ہوئی۔ آیئے اب آپ کو ایک نئی سائنسی تحقیق کے بارے میں بتائیں۔ دُنیا کے مختلف ملکوں میں بعض سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دُوسروں کے ساتھ نیکی کرنے اور اچھے اچھے کام کرنے سے انسان کے جسم میں ایسے ہارمون خوب پیدا ہوتے ہیں جو اُس کے دل کو سکون اور خوشی پہنچاتے ہیں۔ ان ہارمونز کو ماہرین Feel good Hormones کا نام دیتے ہیں۔ یہ بھی خیال ہے کہ یہ ہارمونز انسان کو سرطان سمیت دُوسری بہت سی بیماریوں کا مقابلہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ملک شبیر کی صحت بھی اُن کے Feel good Hormones کا ہی ایک کرشمہ ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

---☆☆---

پاکستان کے عظیم سپوت ایم ایم عالم

رانا محمد شاہد، بورے والا

6 ستمبر کی صبح اور سرگودھا شہر..... لوگ فجر کی نماز سے فراغت کے بعد اپنے کاموں پر جانے کے لئے تیار ہیں اور کچھ مسجدوں سے نکل کر اپنے گھروں کی طرف جا رہے ہیں۔ فضا میں گہری خاموشی ہے۔ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیغام دے رہی ہے۔ کسی بھی لمحے دشمن فضائی حملہ کر سکتا ہے۔ اُس کی وجہ یہ بھی تھی کہ پٹھان کوٹ، آدم پور اور ہلواڑہ کے ہوائی اڈے تباہ ہو چکے تھے اور بھارتی فضائیہ انتقام لینے کے لئے سرگودھا ائیر بیس کی طرف بڑھ سکتی تھی۔

اچانک یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہزاروں توپیں ایک دم داغی گئی ہیں۔ پاکستان ائیر بیس فورس کے چند ہوا باز پرواز کے لئے تیار کھڑے تھے۔ سامنے آسمان پر آگ کے چھ گولے سرگودھا ائیر بیس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ آگ کے گولے در حقیقت بھارتی ائیر فورس کے چھ لڑاکا طیارے تھے، جو جدید اسلحہ سے مکمل طور پر لیس تھے۔ یہ چھ طیارے نیچی پرواز کے ساتھ راکٹ فائر کرتے چلے آرہے تھے۔ لیکن ان کی فائرنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یا تو وہ جلدی میں ہیں یا نہیں ٹارگٹ کے متعلق کوئی شک ہے۔ کیوں کہ وہ جو راکٹ وغیرہ فائر کر رہے تھے، وہ بے نشانہ اور بے ٹھکانہ تھے۔

سائرن کی آواز بلند ہونے لگی۔ چند لمحے سوچنے میں گزرے اور پھر ابھی کوئی کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ پی اے ایف کا ایک لڑاکا طیارہ پرواز کے لئے بلند ہوا۔ فضا میں بلند ہونے والے اس طیارے کے پائلٹ ایم ایم عالم تھے، پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایم ایم عالم بھارتی طیاروں کے پیچھے لگ گئے اور چند لمحات میں تین گولے داغ کر تین بھارتی طیارے مار گرائے۔ باقی تین طیارے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

ابھی ایم ایم عالم پلٹے ہی تھے کہ اپنے آپ کو دُشمن کے کئی طیاروں میں گھرا پایا۔ انہوں نے چند لمحے سوچا اور پھر ایک دم فضا میں کچھ غوطے لگائے اور دوبارہ چند گولے داغ دیئے۔ فضا دھماکوں سے لرز اٹھی اور ہر طرف دھواں ہی دھواں ہو گیا۔ صرف تیس سیکنڈز میں بھارتی طیارے ایک دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو گئے اور پھر ایم ایم عالم کا یہ تاریخی کارنامہ ایک ریکارڈ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ایک دبلے پتلے آدمی نے بھارتی فضائیہ کے چھ طیارے صرف تیس سیکنڈز میں مار گرائے اور پاک فضائیہ کی برتری ثابت کر دی۔ اور چند لمحوں میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔

ایف 16 طیارے کو اُڑانے کے لئے دو سال کی تربیت ضروری ہے لیکن ایم ایم عالم نے صرف 3 ماہ میں سب کچھ سیکھ لیا۔ امریکیوں نے انہوں "پائلٹ آف دی ورلڈ" کا خطاب دیا۔ معروف کتاب "دُنیا کے بہترین پائلٹ" میں ایم ایم عالم کا نام سرفہرست ہے۔

جو لوگ اپنی ذات اور صلاحیت کو دُوسروں کے لئے وقف کر دیں۔ در حقیقت وہی لوگ عظیم ہوتے ہیں اور ایسے لوگ ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ایم ایم عالم کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایم ایم عالم جیسے دلیر اور جری سپوت صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

☆☆

نیا جوڑا

راشد علی (کراچی)

ارے! مجھے پرانے جوڑے کے ساتھ کیوں لٹکا دیا؟"

یاسر نے عید الفطر کے لیے سلوائے ہوئے نئے کاٹن کے سفید جوڑے کو کھونٹی پر لٹکایا تو نیا جوڑا بڑبڑانے لگا۔

"یاسر! اس پھٹے پرانے جوڑے کو مجھ سے علیحدہ رکھو یہ میری ساری شو خراب کر رہا ہے۔"

یاسر نے کچھ سوچتے ہوئے پرانے جوڑے کو دُوسری کھونٹی پر لٹکایا اور نیا جوڑا صحیح کر کے درمیان کی لگی ہوئی کھونٹی پر لٹکایا۔

"ارے دیکھو! کہیں دیوار پر مٹی تو نہیں لگی ہوئی۔"

یاسر نے جوڑے کو ذرا آگے کھسکا کر دیوار دیکھی تو دیوار بالکل صاف تھی۔ اب جوڑے کو اطمینان ہوا۔

عید الفطر میں صرف ایک روز باقی تھا۔ سترہ سالہ یاسر نے اپنے لیے ایک خوب صورت کاٹن کا جوڑا سلوایا تھا اور چاند رات کو اُس نے وہ جوڑا دھوبی سے استری کروا کر کھونٹی پر لٹکا دیا تھا۔ کلف لگا جوڑا بڑا اکڑا اکڑا تھا۔

"یہ کون اکڑا پڑا ہے؟ کیوں سزا دے رکھی ہے اِسے؟"

دادا جان نے اپنی لاٹھی کی نوک سے جوڑے کو اینٹھتے ہوئے کہا۔

یاسر کو ایسے لگا کہ جیسے یہ لاٹھی اُسے ہی لگی ہو۔

"ابا! استری خراب ہو جائے گی۔"

"ارے بیٹا یہ کیسا سوٹ ہے؟"

"دادا ابا! آج کل یہ فیشن ہے۔"

"گولی مارو ایسے فیشن کو۔"

پھر یاسر وہ جگہ صحیح کرنے لگا جہاں دادا ابا کی لاٹھی کی نوک لگی تھی۔

عید کے روز اُس نے وہ جوڑا زیب تن کیا۔ کلف لگا ہوا جوڑا پہن کر وہ عید گاہ کی طرف چلا۔ عید گاہ میں وہ بڑی احتیاط سے بیٹھا کہ استری خراب نہ ہو جائے۔

"اتنی بڑی بڑی دو آنکھیں ہیں آپ کی پھر بھی آپ کو نظر نہیں آرہا۔"

یاسر کی قمیص کے دامن پر ایک نمازی کا پاؤں آیا تو وہ لال پیلا ہو گیا۔ جب تک وہ شخص اُس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا وہ برابر اُسے گھورتا رہا۔

عید کی نماز کے بعد عید گاہ ''عید مبارک، عید مبارک'' سے گونج اٹھی۔ ہر نمازی دُوسرے کو گلے مل کر عید مبارک کہنے لگا۔

''یاسر! خیال سے کہیں میری کلف خراب نہ ہو جائے۔'' جوڑے نے یاسر سے کہا۔

''دادا ابا! عید مبارک۔''

''ارّے میرا بیٹا!'' یہ کہتے ہی دادا جان نے اُسے زور سے گلے لگا لیا۔

''ارے بچاؤ..... بچاؤ..... بچاؤ.....''

جوڑے نے چیخ وپکار کی۔ مارے غم کے یاسر کا دل بیٹھنے لگا۔

عید مل کر اُس نے جوڑے کی طرف دیکھا تو اُس کی کلف خاصی خراب ہو چکی تھی۔ گھر والوں سے عید مل کر وہ دوستوں کی طرف گیا۔

''یاسر! اب ذرا دھیان سے۔'' جوڑا کہنے لگا۔

''یار! بہت اچھا جوڑا لگ رہا ہے!''

علی نے عید ملنے کے بعد کہا۔ اس تعریف پر یاسر جوڑے سمیت اکڑ گیا۔

''علی! چلو یار اب باہر چلتے ہیں۔''

''آؤ باہر چلتے ہیں۔''

بازار کی طرف جاتے ہوئے ابھی وہ گلی کی نکڑ پر ہی پہنچے تھے کہ ایک سائیکل سوار گزرا تو کیچڑ کی چھینٹیں یاسر کے جوڑے پر پڑ گئیں۔

''اندھے ہو کیا؟ نظر نہیں آتا۔''

یاسر کو ہم عمر سائیکل سوار نے پلٹ کر دیکھا اور بریک لگاتے ہوئے بولا:

''اندھے تو تم ہو، دیکھ کر نہیں چل سکتے۔''

تھوڑی دیر بعد دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

''ارے یاسر چھوڑو یار!'' علی بیچ بچاؤ کرانے لگا۔

''مجھے بچاؤ..... بچاؤ..... بچاؤ'' جوڑے پر بُری طرح سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔ سائیکل سوار لڑکے کا ایک زور دار تھپڑ یاسر کو لگا تو جواباً غصے سے بپھر کر اُس نے ایک مکا سائیکل سوار کو رسید کیا مگر وہ پھرتی سے ایک طرف ہو گیا۔ یاسر کا مکا سائیکل کے کیئر پر جا لگا۔

''ہائے!'' اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اُس کے ہاتھ پر شدید چوٹ آئی تھی۔

''یاسر! اپنی فکر چھوڑو۔ میری فکر کرو۔'' جوڑے نے کہا۔

دونوں کی جاری لڑائی کو دو آدمیوں نے ختم کروایا۔

یاسر کو ایک آدمی نے پکڑا اور سائیکل سوار لڑکے کو دُوسرے آدمی نے پکڑا۔ دونوں لڑنے والے مرغوں کی طرح گردن اکڑا اکڑا ایک دُوسرے کو گھور رہے تھے۔ دونوں آدمیوں نے انہیں مضبوطی سے دبوچا ہوا تھا۔

''انکل! اس نے میرے کپڑے خراب کیے ہیں اور یہ اُوپر سے اکڑ بھی رہا ہے۔'' یاسر نے کہا۔

''بیٹا! معاف کرنا بدلہ لینے سے بہتر ہے۔'' دُوسرے آدمی نے سائیکل والے لڑکے کو سائیکل پر سوار کرایا اور اُسے سمجھاتے ہوئے اپنے سامنے روانہ کیا۔ یاسر اُسے جاتے ہوئے مسلسل گھورتا رہا۔

دیواروں پر 2009ء کے بجائے 2010ء کے کلینڈر آچکے تھے۔ ایک سال بیت گیا تھا۔ پندرہ سالہ یاسر نے اس مرتبہ بوسکی کا ایک بہت نفیس اور اعلیٰ جوڑا خریدا تھا۔ جوڑا سل کر آچکا تھا۔ امی نے اُسے دھونے کے لیے کپڑوں کے ایک ڈھیر میں رکھا ہوا تھا اور پرانے کپڑے نکال کر چھانٹی کر رہی تھیں۔

''ارے نئے بھائی! تمہاری اکڑ بھی چند روز میں ختم ہو جائے گی۔'' کاٹن کے پرانے جوڑے نے کہا۔

آج وہ کپڑوں کے پرانے ڈھیر میں پڑا تھا۔

"پرانے کپڑے دے کر برتن لے لو..... پرانے کپڑے دے کر برتن لے لو۔"

باہر سے ایک ریڑھی والے کی آواز آئی جو پرانے کپڑوں کے عوض برتن دیتا تھا۔

"یاسر بیٹا! پرانے کپڑوں کا یہ ڈھیر دے کر برتن لے آؤ۔"

اُس نے وہ ڈھیر سمیٹا جس میں کاٹن کا پرانا جوڑا بھی تھا۔

ریڑھی والے نے کپڑوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ وہ تھا جسے وہ استری کر کے دوبارہ بیچ سکتا تھا۔ ایسے کپڑوں کے اُس نے برتن دے دیے۔

"بھائی! یہ کپڑے تو بہت پرانے ہیں یہ موٹر سائیکل مکینک ہی لیں گے، ان سے وہ اپنی موٹر سائیکلیں صاف کریں گے، ان کے پیسے کم ہوں گے۔"

"ارے دے بھائی جتنے پیسے بنتے ہیں۔" یاسر بولا۔

چند دنوں میں وہ جوڑا ایک موٹر سائیکل مکینک کے ہاتھ میں تھا اور وہ اب بالکل سیاہ ہو چکا تھا۔ عید سے دو دن پہلے یاسر اپنی موٹر سائیکل صحیح کروانے کے لئے مکینک کے پاس آیا تو اُس کی موٹر سائیکل کے ہینڈل سے ایک لفافہ لٹک رہا تھا جس میں بوسکی کا ایک نیا جوڑا تھا۔ کاٹن کے پرانے جوڑے نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"میں بھی ایک سال پہلے تمہاری طرح بالکل نیا جوڑا تھا، میں اُس وقت غرور میں مبتلا ہو گیا تھا، تم میری طرح نہ کرنا اس لیے کہ غرور اللہ کو پسند نہیں۔"

"میں غرور نہیں کروں گا۔" بوسکی کے جوڑے کی بات سن کر کاٹن کا پرانا جوڑا خوش ہو گیا تھا۔

---☆☆---

خوش خبری... خوش خبری ...خوش خبری

"تعلیم و تربیت" کا دسمبر 2010ء کا شمارہ ہو گا

"کہانی نمبر"

کہانی نمبر میں آپ اپنے پسندیدہ ادیبوں حسن ذکی کاظمی، اشتیاق احمد، کلیم چغتائی، وقار محسن، پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی، پروفیسر ظریف خان، اعتبار ساجد، محمد فاروق دانش، نجمہ یاسمین یوسف، علی اکمل تصور، غلام حسین میمن، ڈاکٹر طارق ریاض خان، محمد عادل منہاج، محمد عارف عثمان، محمد فہیم عالم، راشد علی، خلیل جبار، شازیہ فرحین، محمد فاروق انجم، ذیشان بن صفدر، ذیشان قریشی اور نذیر انبالوی کی دل چسپ، مزے دار اور بامقصد کہانیاں پڑھ سکیں گے۔

کہانی نمبر کے لیے آپ بھی لکھ سکتے ہیں۔ کہانی بھیجنے کی آخری تاریخ 30 ستمبر 2010ء ہے۔

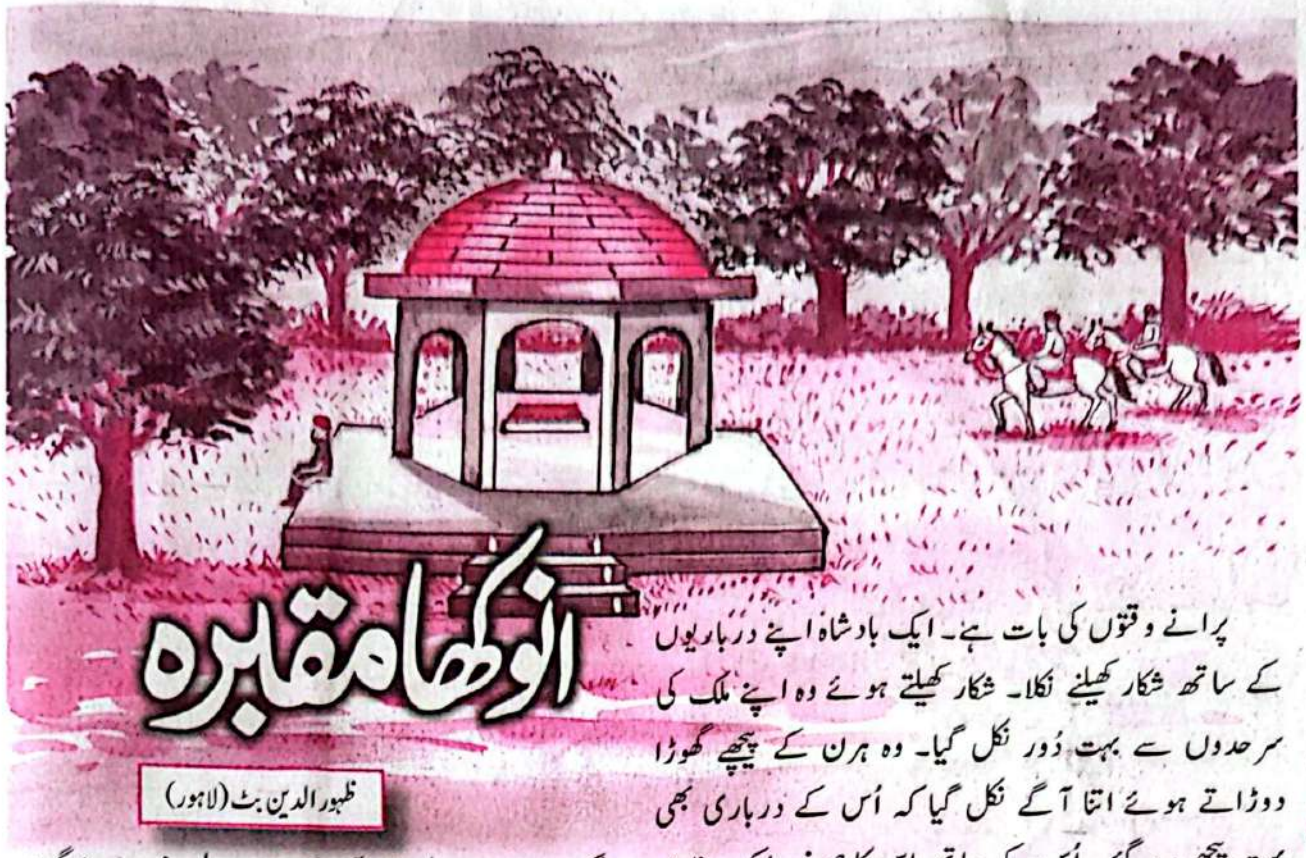

انوکھا مقبرہ

ظہور الدین بٹ (لاہور)

پرانے وقتوں کی بات ہے۔ ایک بادشاہ اپنے درباریوں کے ساتھ شکار کھیلنے نکلا۔ شکار کھیلتے ہوئے وہ اپنے ملک کی سرحدوں سے بہت دُور نکل گیا۔ وہ ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اتنا آگے نکل گیا کہ اُس کے درباری بھی بہت پیچھے رہ گئے۔ اُس کے ساتھ اس کا صرف ایک وفادار ساتھی جلال رہ گیا تھا۔ وہ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ہرن اچانک جھاڑیوں میں گم ہو گیا تھا۔ ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے انہیں وقت اور دھوپ کا احساس ہی نہ رہا تھا۔ اب جو ہرن اُن کی نظروں سے اوجھل ہوا تو انہیں پیاس کا شدید احساس ہوا۔

بادشاہ نے گھوڑے کے ساتھ بندھے مشکیزے کی طرف دیکھا تو اُس کا منہ کھلا پایا۔ خدا جانے کب اس کا منہ خود بخود کھل گیا اور سارا پانی گر گیا تھا۔ بادشاہ کو پیاس لگی دیکھ کر جلال نے اپنا مشکیزہ اُس کے حوالے کر دیا۔ پانی پینے کے بعد بادشاہ کے حواس بحال ہوئے تو اُس نے محسوس کیا کہ گرمی اور پیاس کے مارے اُس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اُس نے اِردگرد نظریں دوڑائیں تو اُسے کچھ فاصلے پر ایک گنبد نما عمارت نظر آئی۔ تیز دھوپ میں وہ گنبد نما عمارت اسے بہترین پناہ گاہ محسوس ہوئی۔ عمارت کے قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ اس کے پیچھے کی جانب چند سایہ دار درخت اور ایک کنواں موجود ہے۔ بادشاہ اور جلال گرمی سے بے حال ہو چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے گھوڑے درختوں کے نیچے چھوڑ دیے اور خود گنبد نما عمارت میں داخل ہو گئے۔ گنبد کے اندر پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ یہ کسی کا مزار ہے۔ مزار کے سرہانے ایک تختی پڑی تھی۔ اس پر وہاں دفن ہونے والے کے بارے معلومات لکھی ہوئی تھیں۔ بادشاہ کے اشارہ کرنے پر جلال نے وہ تختی اٹھا کر پڑھنا شروع کر دی۔

تختی پر لکھا تھا، "یہ ایک وفادار کتے کی قبر ہے۔ اس کتے نے اپنے مالک کی جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ اگر کوئی شخص اس وفادار کتے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہو تو وہ شمال مشرق کی جانب چند کوس کے فاصلے پر موجود بستی میں چلا جائے اور وہاں عبداللہ تیر گر کا پوچھ لے۔ عبداللہ تیر گر اس کتے کے بارے میں ساری معلومات رکھتا ہے۔"

بادشاہ کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ وفادار کتے کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اس مقبرے میں پہنچ کر انہیں ٹھنڈک اور راحت کا احساس ہوا۔ کچھ دیر آرام کے بعد

جلال نے دستر خوان نکالا اور مقبرے کے فرش پر بچھا دیا۔ اس نے کھانا دستر خوان پر رکھا اور خود بادشاہ کے لیے کنوئیں سے ٹھنڈا پانی لینے چلا گیا۔ جلال واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ بادشاہ نے کھانا کھانا شروع نہیں کیا۔ اُسے دیکھ کر بادشاہ نے اس کا نام پکارتے ہوئے کہا:

"آؤ جلال! میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔" جلال بادشاہ کی یہ بات سن کر ہچکچایا لیکن بادشاہ نے جب دوبارہ بڑے پیار سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ دستر خوان کے دُوسرے کنارے کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو مقبرے کے اندر موجود ٹھنڈک اور شکار کی تلاش میں لمبے سفر کی وجہ سے ان کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ گہری نیند سو چکے تھے۔

---☆☆---

وہ نیند سے بیدار ہوئے تو سورج خدا جانے کب کا غروب ہو چکا تھا۔ جلال نے دیکھا کہ وہاں بنے ہوئے طاقوں میں تیل کے چراغ رکھے ہوئے ہیں۔ چقمق کی مدد سے اُس نے چراغ روشن کر دیئے۔ روشنی میں انہیں مزار کے اندر بنے نقش ونگار بڑے خوب صورت لگے۔ جلال نے مقبرے کے عقبی حصے میں جا کر دیکھا تو گھوڑے گھاس چر چکے تھے۔ اُس نے انہیں درختوں سے باندھ دیا۔ کنوئیں سے ڈول کے ذریعے پانی نکال کر اُس نے غسل خانے میں رکھ دیا۔ پھر اس نے بادشاہ کو اطلاع کی کہ اگر وہ نہانا چاہیں تو نہا لیں۔ غسل سے فارغ ہو کر انہوں نے کھانا کھایا۔ پھر انہوں نے اگلی صبح عبداللہ تیر گر سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ بادشاہ جلداز جلد وفادار کتے کی کہانی سننا چاہتا تھا۔ وہ صبح اٹھے۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے وہاں درختوں سے پھل توڑ کر کھائے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ جو کھانا وہ ساتھ لائے تھے وہ ختم ہو چکا تھا۔ یہاں دُور دُور تک کسی بستی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے پھلوں سے پیٹ بھر لیا اور اپنے مشکیزے پانی سے بھر لیے۔ اب وہ اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔ سمت معلوم کرنے کے لیے انہوں نے قطب نما سے مدد لی تھی۔ گھوڑے تازہ دم تھے اس لیے اس بستی تک پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہ لگی۔ بستی کے لوگوں نے بادشاہ کا قیمتی لباس اور خوبصورت گھوڑے دیکھ کر ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ جب انہیں پتہ چلا کہ مہمان عبداللہ تیر گر سے ملنا چاہتے ہیں تو ایک آدمی انہیں عبداللہ تیر گر کا گھر دکھانے کے لیے ان کے ساتھ گیا۔ اُس نے عبداللہ کے گھر پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک لمبی داڑھی والا بوڑھا گھر سے باہر آیا۔ اُسے دیکھ کر آدمی نے کہا:

"بابا عبداللہ! دیکھو یہ تمہارے مہمان آئے ہیں۔" پھر وہ شخص بابا عبداللہ سے اجازت لے کر چلا گیا۔

بوڑھے آدمی نے آگے بڑھ کر مہمان کو خوش آمدید کہا۔ پھر اُس نے شہباز کہہ کر کسی کو پکارا۔ چند لمحوں بعد گھر کے اندر سے آواز آئی: "جی بابا جی! میں حاضر ہوا۔" آنے والا اٹھارہ انیس سال کا خوب صورت نوجوان تھا۔ اُس کا مضبوط اور گٹھا ہوا جسم بتاتا تھا کہ وہ سخت محنت کرنے والا نوجوان ہے۔ بوڑھے آدمی نے شہباز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"بیٹا! دیکھو ہمارے گھر اللہ کی رحمت آئی ہے۔ تم پہلے مہمانوں کے لیے بیٹھنے کا انتظام کرو۔ بعد میں گھوڑوں کو بھی چرنے کے لیے چھوڑو۔"

مہمانوں کی خاطر تواضع کے بعد عبداللہ نے مہمانوں سے آنے کا مقصد دریافت کیا تو بادشاہ نے کہا: "اے بزرگ میں ہمسایہ ملک رسول نگر کا بادشاہ عبدالحکیم خان ہوں اور یہ میرے دوست جلال ہیں۔ کل ہم شکار کا پیچھا کرتے ہوئے راستے سے بھٹک گئے تھے اور اس مقبرے تک جا پہنچے تھے، جہاں وفادار کتا دفن ہے۔ وہیں سے ہمیں آپ کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ ہم آپ سے اس جانثار جانور کی کہانی سننا چاہتے ہیں۔" بادشاہ کی یہ بات سن کر بابا عبداللہ نے کہا: "اچھا تو اس وفا شعار کتے کی کہانی سننے کا تجسس آپ کو یہاں لے آیا ہے۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کی رعایا آپ کی قیادت میں ترقی کی منزلیں طے کرے۔ میں آپ کو اس کتے کی کہانی ضرور سناؤں گا۔ آپ جس جگہ بیٹھے ہیں، دو سو سال پہلے اس ملک کا نام شام نگر تھا۔ یہاں ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھا۔

میرے دادا اس ہندو راجہ کرشن کمار کے شاہی کارخانے میں تیر کمان بنانے والوں کے نگران تھے۔ یہ راجہ بڑا رحم دل اور نیک تھا۔ وہ اپنی رعایا اور ملازمین کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اُس کے دو بیٹے تھے، چاند کمار اور سورج کمار۔ باپ کی زندگی میں ہی انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ کرشن کمار نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹوں میں اپنے ملک کا آدھا آدھا حصہ بانٹ دیا تھا۔ چاند کمار کا اسلامی نام قمر الاسلام اور سورج کمار کا نام شمس الاسلام رکھ دیا گیا تھا۔ جس کتے کی کہانی آپ سننا چاہتے ہیں وہ چاند کمار نے پال رکھا تھا۔ یہ کتا ہر جگہ اُس کے ساتھ رہتا تھا۔ قمر الاسلام بھی اس کتے کو بہت چاہتا تھا۔ وہ اس کی خوراک اور آرام کا خاص خیال رکھتا تھا۔ بادشاہ نے کئی آدمی اس کی خدمت پر لگا رکھے تھے۔

بادشاہ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ وہ ہفتے کی شام سے ہی شکار کی تیاری شروع کر دیتا تھا۔ وہ بہت بہادر اور انصاف پسند تھا۔ کھانے کے لیے جو کچھ اُسے مل جاتا، کھا کر اللہ کا شکر بجا لاتا تھا۔ البتہ میٹھے میں اُسے دودھ اور بادام کی بنی ہوئی کھیر بہت پسند تھی۔ اُس کی ملکہ نے بادشاہ کے لیے کھیر پکانے کے لیے خاص باورچی رکھے ہوئے تھے۔ وہ اتنی لذیذ کھیر پکایا کرتے تھے کہ جو ایک مرتبہ کھا لیتا تو انگلیاں چاٹتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ وہ شکار کے لیے جانے لگا تو اُس نے اپنی ملکہ سے کھیر پکانے کی فرمائش کی۔ ملکہ جو اپنے شوہر کی پسند ناپسند کا بہت خیال رکھتی تھی، کہنے لگی: ”میرے سرتاج! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، آپ جب شکار سے واپس آئیں گے تو آپ کو کھیر تیار ملے گی۔“ بادشاہ ملکہ سے کھیر پکوانے کی فرمائش کر کے شکار کھیلنے چلا گیا۔ ملکہ نے اپنی خادمہ کو بھیج کر بھینسوں کے باڑے سے خالص دودھ منگوایا۔ اُسے باورچی کے حوالے کر کے بڑی عمدہ اور لذیذ کھیر پکانے کا حکم دیا۔ باورچی نے دودھ گرم کیا اور اُس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اِس دوران باورچی کو کوئی کام یاد آ گیا۔ اُسے دودھ والے برتن پر ڈھکن رکھنا یاد نہ رہا۔ باورچی کے جانے کے بعد اتفاق سے بادشاہ کا پالتو پیارا کتا اور ایک گونگی لنگڑی خادمہ باورچی خانے میں موجود تھی۔ گونگی خادمہ نے دیکھا کہ ایک سانپ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ دودھ والا برتن کھلا تھا۔ سانپ نے دودھ میں منہ ڈالا اور اپنا زہر دودھ والے برتن میں چھوڑ دیا۔ کتا اور گونگی خادمہ کے دیکھتے ہی دیکھتے سانپ نے اس برتن میں سے دودھ پیا اور جس طرف سے آیا تھا اُسی جانب واپس چلا گیا۔“

یہ کہہ کر بوڑھے عبداللہ نے ایک لمبا سانس لیا، بادشاہ کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور پھر کہنے لگا: ”اے بادشاہ! وفادار کتا اور گونگی لنگڑی خادمہ خاموشی سے یہ تماشا دیکھتے رہے اور کچھ نہ کر سکے۔ تھوڑی دیر بعد باورچی اپنا کام کر کے واپس آیا تو گونگی لنگڑی خادمہ نے اشارے سے اُسے بات سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اسی طرح کتا بھی بھونک بھونک کر خاموش ہو گیا۔ باورچی نے بڑے شوق سے پستہ بادام اور دُوسرے میوہ جات ڈال کر بہت لذیذ کھیر تیار کر لی۔ دو تین دن بعد بادشاہ شکار سے فارغ ہو کر اپنے محل میں پہنچا تو اُس نے سب سے پہلے کھانے کے لیے کھیر مانگی۔ کتا مسلسل بھونک بھونک کر بادشاہ کو کھیر کھانے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن بادشاہ نے کوئی توجہ نہ دی۔ بادشاہ سمجھا، کتا بھوکا ہے اس لیے بھونک رہا ہے۔ بادشاہ کے حکم پر اُس کی پسندیدہ خوراک اُسے دی گئی۔ کتے نے اُسے دیکھنا تک پسند نہ کیا۔ وہ مسلسل بھونکتا رہا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے غلاموں کو حکم دیا کہ کتے کو اُس کے سامنے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے کھیر کھانے کی کوشش کی۔ خادم کتے کو وہاں سے لے جانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے کہ اچانک کتے نے جست لگائی اور بادشاہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ اس کے ایسا کرنے سے چمچ بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر دُور جا گرا اور کھیر والی پلیٹ بھی الٹ گئی۔ یہ دیکھ کر بادشاہ غصے میں آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کتے کو اس کی گستاخی کی کیا سزا دے؟ اس کی نظر کتے کی طرف گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ گری ہوئی پلیٹ سے کھیر کھا رہا تھا۔ اگرچہ کتے نے کبھی پہلے ایسی حرکت نہ کی تھی لیکن اب بادشاہ کے لیے اس کی یہ حرکت

ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنی تلوار سنبھالی اور کتے کو قتل کر دینا چاہا۔

وہ کتے کو قتل کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اُس نے دیکھا، کتے کے منہ سے خون بہنا شروع ہو گیا اور وہ آناً فاناً مر گیا۔

بادشاہ حیران و پریشان کھڑا کتے کی حالت دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے کتے کے جسم کا گوشت بھی جگہ جگہ سے پھٹ گیا۔ بادشاہ نے فوراً شاہی حکیم کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ تب گونگی اور لنگڑی لڑکی نے آگے بڑھ کر بادشاہ کو سارا قصہ سمجھا دیا۔ تھوڑی دیر میں شاہی حکیم بھی بادشاہ کے حضور پیش ہو گیا۔ اُس نے کتے کا معائنہ کرنے کے بعد گونگی اور لنگڑی لڑکی کی بات کی تصدیق کر دی۔ اب بادشاہ کو کتے پر بڑا ترس آیا۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ جانور کتنا وفادار ہے۔ اُس نے اپنی جان دے کر اُس کی جان بچالی۔"

یہ کہہ کر بوڑھا عبد اللہ خاموش ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"بادشاہ نے اپنے خادموں اور وہاں موجود درباریوں سے کہا کہ وہ اس وفادار اور محبت کرنے والے کتے کو یہیں پڑا رہنے دیں۔ وہ خود اسے اٹھائے گا اور دفن کرے گا۔ پھر ہمارا نیک دل بادشاہ خود اس وفادار کتے کو اٹھا کر اس جگہ پہنچا جہاں اس کی قبر اور مقبرہ بنایا گیا تھا۔ مقبرے کے ساتھ اُس نے وہاں سے گزرنے والے مسافروں کے آرام کے لیے پھل دار درخت لگوائے اور کنواں کھدوایا۔"

ساری کہانی سن کر بادشاہ نے کہا: "ہم اس وفادار کتے اور نیک دل بادشاہ کو سلام کرتے ہیں۔" پھر اُس نے اپنی جیب سے سونے کے سکے نکال کر عبداللہ کو دیتے ہوئے مخاطب کیا:

"بابا! آپ آج ہی اس مقبرے کے گرد ایک آرام دہ سرائے تعمیر کرنے کا بندوبست کریں۔ ہم چند دنوں تک وفادار کتے کے مزار پر واپس آئیں گے تاکہ اس منصوبے کو مکمل کیا جائے۔ اگر آپ چاہیں تو ہمارے ملک چلیں۔ وہاں ہتھیار بنانے کے تمام کارخانے آپ کی نگرانی میں دے دیئے جائیں گے۔" یہ کہہ کر بادشاہ اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ بابا عبداللہ کے دروازے پر کھڑا اس وقت تک اس نیک دل بادشاہ کو دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

---☆☆---

س	ع	م	ا	ن	ی	ن	م	ا	ج
ر	م	د	ر	ن	ا	ر	ن	ج	ی
خ	ش	ن	ک	ا	ل	ا	ح	ی	ا
ر	ت	ت	ا	م	ی	ب	ا	ل	گ
گ	ق	ر	ک	ی	پ	ی	ل	ا	س
ب	ن	ی	ل	ا	چ	غ	ن	ر	ا
ی	ج	ا	ف	ن	د	ص	گ	س	ت
ت	م	س	ڈ	ظ	ی	ط	ی	ز	ڑ
م	ا	ل	ٹ	ا	ف	ٹ	ا	ب	ل
ع	د	ڈ	آ	ح	س	ت	ش	س	ن

آپ نے حروف ملا کر دس رنگ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان رنگوں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن رنگوں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

سفید۔ پیلا۔ سبز۔ کالا۔ سرخ۔ جامنی۔ نارنجی۔ گلابی۔ مالٹا۔ نیلا۔

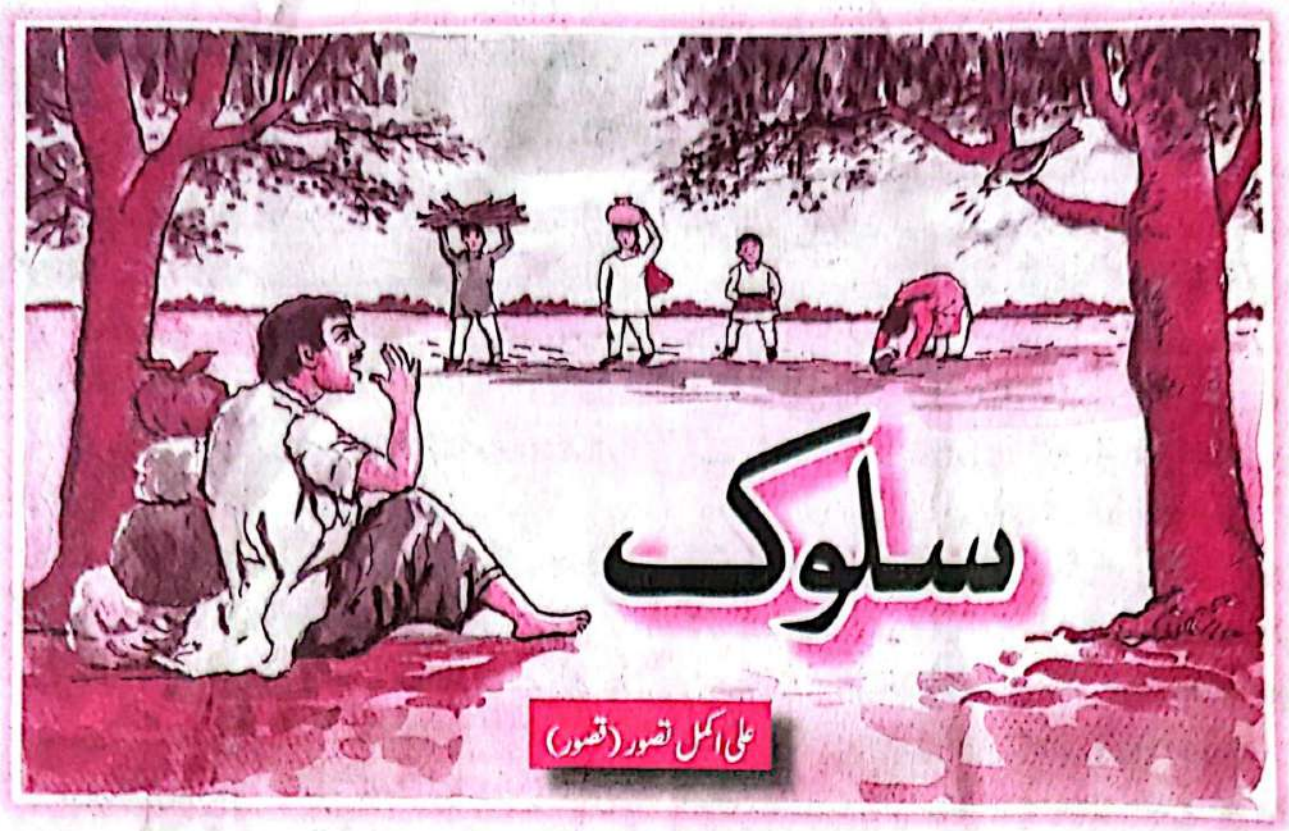

سلوک

علی اکمل تصور (قصور)

جب ہم چھوٹے تھے تو ہمارے والد صاحب ہمیں کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ روزانہ شام کو ہماری حویلی کے بڑے سے صحن میں محفل سجا کرتی تھی۔ ہم چار بھائی اور پڑوس کے بچے بچیاں ابو جی کو گھیر لیتے تھے۔ میں سب سے چھوٹا تھا، اس لیے ابو کی گود میں بیٹھنے کا حق میرا تھا۔ میرے تینوں بڑے بھائی یہ حق حاصل کرنے کے لیے آپس میں لڑتے تھے، لیکن پھر ابو جی کی ایک ترچھی نظر سے وہ اپنا احتجاج ختم کر دیتے تھے۔ اب ساری توجہ کہانی سننے پر مرکوز ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں کہانی سننے کے دوران ہی سو گیا۔ لیکن ایک کہانی ایسی تھی جو مجھے سونے نہیں دیتی تھی۔ میں سب کہانیاں بھول گیا، لیکن وہ کہانی مجھے یاد رہی۔ اور آج پھر وہ کہانی مجھے بہت یاد آ رہی ہے۔ وہ کہانی کچھ یوں تھی۔

کسی گاؤں میں ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ تنگ دستی نے اُس کی حالت خراب کر رکھی تھی۔ کام ملتا نہیں تھا۔ اس لیے گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ اُس کا ایک بھائی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن وہ خود غرض تھا۔ وہ اپنے اس مجبور بھائی کی مدد نہیں کرتا تھا۔ لوگوں سے قرض مانگ کر وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام کرتا تھا۔ اور اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کوئی اُسے قرض نہیں دیتا تھا۔ الٹا لوگ اُس سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے لگے۔ راہ چلتے لوگ اُسے روک لیتے۔ دروازے پر دستک دیتے، اُس کا گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک رات اُس نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے میں اُس کے بیوی بچے بھی شامل تھے۔ آدھی رات کو یہ مفلس گھرانہ اللہ کے بھروسے پر بے سروسامانی کی حالت میں گاؤں سے نکل پڑا۔ اندھیرے کی وجہ سے یہ لوگ راستہ بھٹک گئے۔ اور جنگل کی طرف نکل آئے۔ سورج نکلا، روشنی پھیلی لیکن انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ بھوک پیاس کے عالم میں سفر کرتے انہیں نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ یہ لوگ نڈھال ہو کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ درخت کی شاخ پر ایک سنہری چڑیا بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس غریب آدمی نے نظر بھر کر چڑیا کی طرف دیکھا اور پھر اپنے بڑے بیٹے سے کہا:

"بیٹا! خشک لکڑیاں جمع کر کے لاؤ....."

"جی ابو جی!" وہ فرمانبرداری سے بولا۔ اور خشک لکڑیوں کی تلاش میں نکل گیا۔ پھر اُس غریب آدمی نے اپنے منجھلے بیٹے سے کہا:

"بیٹا! یہاں چماق پتھر ہوں گے جن کی رگڑ سے آگ جل جاتی ہے۔ وہ پتھر ڈھونڈ کے لاؤ۔"

"جی ابو جی!" وہ بھی فوراً ہی حکم کی تکمیل میں روانہ ہو گیا۔ اب وہ آدمی اپنی بیٹی سے کہنے لگا:

"پیاری بیٹی! یہاں قریب ہی پانی کا چشمہ موجود ہو گا۔ ذرا پانی بھر لاؤ۔"

"جی ابو جی!" پھر وہ پانی کی تلاش میں نکل گئی۔ چند لمحے گزرنے کے بعد وہ آدمی اپنی بیوی سے کہنے لگا:

"اللہ کی نیک بندی..... یہاں مٹی کے ڈھیلے بکھرے ہوئے ہیں۔ انہیں جمع کر کے چولہا بناؤ....."

وہ فوراً اٹھی اور مٹی کے ڈھیلے جمع کر کے چولہا بنانے لگی۔ ایسے میں درخت کی شاخ پر بیٹھی سنہری چڑیا کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ وہ غریب آدمی اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا..... تم کیوں ہنس رہی ہو؟" غریب آدمی نے سوال کیا۔

"تم سے بڑا احمق میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔"

"کیا مطلب؟" غریب آدمی حیرت سے بولا۔

"میں دیکھ رہی ہو تمہارے پاس کھانے پکانے کا کوئی سامان موجود نہیں پھر بھی تم لوگ آگ جلانے کا اہتمام کر رہے ہو، ارے بے وقوف آگ تو جل جائے گی، لیکن آگ پر کیا پکاؤ گے.....؟

چڑیا کی ہنسی اور زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ کچھ سوچ کر غریب آدمی بولا:

"تم شکار کی فکر مت کرو۔ ابھی میرے بچے واپس لوٹ آئیں گے۔ پھر ہم مل کر تمہیں پکڑیں گے اور تمہارا شوربہ بنا کر پئیں گے....." سنہری چڑیا کی آنکھوں میں خوف اُتر آیا۔ ڈر کی وجہ سے وہ کانپنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو..... میں غلطی پر تھی..... میں نے دیکھا ہے، تم لوگوں میں پیار ہے۔ ایک دُوسرے کا ادب ہے۔ آپس میں سلوک ہے، اگر تم لوگوں نے ارادہ کر لیا تو ضرور مجھے پکڑ لو گے۔ میری جان مت لو۔ میں تمہیں بہت دولت دوں گی۔ یہ دولت میرے لیے بے کار ہے، لیکن تمہارے لیے کار آمد ہے، میرے ساتھ آؤ میں تمہیں خزانے کا پتہ بتاتی ہوں۔"

سنہری چڑیا اُس غریب آدمی کو اپنے ساتھ لے گئی اور اُسے پوشیدہ خزانے کا پتہ بتا دیا۔ یہ مفلس گھرانہ دولت مند بن کر واپس گاؤں لوٹ آیا۔ چند دنوں میں ہی گاؤں والوں کو علم ہو گیا کہ وہ غریب آدمی اب خوش حال ہو چکا ہے۔ مجبوری میں لیے ہوئے تمام قرض اُس نے لوٹا دیئے تھے۔ پھر اُس غریب آدمی کا عیار اور مکار بھائی اُس کے گھر آیا۔ وہ اپنے بھائی سے اُس کے امیر ہونے کا راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ سادہ لوح بھائی نے ساری کہانی اپنے بھائی کو سنا دی۔ اب یہ مکار بھائی خزانے کے حصول کے لیے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ لمبی مسافت نے اُن سب کو تھکا دیا تھا۔ تپتی دوپہر میں یہ لوگ مطلوبہ درخت کے پاس پہنچے۔ سنہری چڑیا درخت پر بیٹھی چہچہا رہی تھی۔ ان اجنبیوں کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔ وہ سب درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اب مکار بھائی اپنے بڑے بیٹے سے کہنے لگا:

"بیٹا! جاؤ خشک لکڑیاں جمع کر کے لاؤ....." بیٹا وہ تھکا ہوا تھا۔ اُس نے گھور کر اپنے باپ کی طرف دیکھا اور تلخی سے بولا:

"ابو جی! تھوڑا آرام کرنے دیجئے، میری ٹانگوں میں درد ہے....." یہ سن کر باپ سٹپٹا گیا۔ پھر وہ اپنے منجھلے بیٹے سے کہنا لگا:

"بیٹا! آگ جلانے کے لیے چماق پتھر لے آؤ....."

"آگ جلانے کے بعد آپ ہمیں بھی اُسی آگ میں جھونک دیجئے گا، کیا مصیبت ہے، میں تو نہیں جاتا....."

اُس نے بھی انکار کر دیا۔ اب وہ مکار اپنی بیٹی سے کہنے لگا:

"بیٹی! مجھے پانی کی ضرورت ہے۔"

"میں تو نہیں جاتی..... مجھے جنگلی جانوروں سے ڈر لگتا ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ مکار اپنی بیوی سے کچھ کہتا وہ سنہری چڑیا زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولی:

"وہ اور لوگ تھے جو خزانہ لے گئے۔ تمہیں یہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ تمہارا تو آپس میں سلوک ہی نہیں ہے....."

اتنا کہہ کر وہ چڑیا پھر سے اڑ گئی۔ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ہم اس کہانی میں موجود سبق کو سمجھنے کے قابل نہیں تھے۔ آج میں سوچتا ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ ابو جی کے بار بار یہ کہانی سنانے کا مقصد یہ تھا کہ ہم بھائیوں میں اُس غریب آدمی کے بچوں جیسا پیار، سلوک اور فرمانبرداری پیدا ہو جائے۔ سلوک کی طاقت ہمیں ہر مصیبت سے بچانے کا باعث بن جائے گی۔ لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ ابو جی کی وفات کے بعد ہمارا گھرانہ تنکوں کی طرح بکھر گیا۔ ہم ابو جی کی سنائی تمام کہانیاں بھول گئے۔ اور آج مجھے یہ کہانی بہت شدت کے ساتھ یاد آئی تھی۔ اور آج ہی میں اس کہانی میں موجود سبق کو سمجھ پایا تھا۔

ہماری بڑی سی آبائی حویلی کے چار حصے ہو چکے تھے جس صحن میں محفل سجتی تھی۔ اُس صحن کے سینے پر بلند دیواریں تعمیر ہو چکی تھیں۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ہم چار بھائیوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ کوئی رشتہ نہیں تھا کوئی سلوک نہیں تھا، گھر میں داخل ہوتے یا نکلتے وقت ہم بھائی ایک دُوسرے کا چہرہ دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ دولت کی ہوس اور آپس کی رنجشوں نے ہمیں جانور بنا دیا تھا۔ ہمارے دلوں سے نرمی چھین لی گئی تھی۔ امی میرے ساتھ رہتی تھیں۔ میں اکثر سجدے کی حالت میں انہیں دُعا مانگتے دیکھتا تھا۔

"یا اللہ..... میرے بچوں میں سلوک پیدا کر، انہیں مصیبتوں سے بچا....."

سلوک نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی طاقت اور رزق میں برکت کھو چکے تھے۔ ابو جی کی سنائی کہانی اس لیے یاد آئی تھی کہ میری آٹھ ماہ کی بیٹی بیمار ہو گئی تھی۔ گاؤں میں موجود حکیموں اور ڈاکٹروں سے جب مرض پر قابو نہ پایا گیا تو میں اپنی بچی کو لے کر لاہور کے ایک بڑے ہسپتال میں چلا آیا۔ میری بچی کو فوراً ہی داخل کر لیا گیا۔ اب میں اپنی بیوی کے ہمراہ ہسپتال میں رہنے پر مجبور تھا۔ یہاں میں نے دُکھ درد میں مبتلا مریضوں کو دیکھا۔ لوگ اپنے پیاروں کو زخمی حالت میں یا پھر بیماری کی حالت میں روتے ہوئے لاتے تھے۔ جو صحت یاب ہو جاتے تھے وہ ہنستے ہوئے لوٹ جاتے تھے، لیکن جن کا مریض مر جاتا تھا۔ اُن کا دکھ دیکھ کر دل مٹھی میں آجاتا تھا۔ یہاں مجھے زندگی اور موت کی حقیقت کا علم ہوا۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا۔ اُس کی آنکھ میں چوٹ لگی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک درجن سے زائد لوگ ہسپتال آئے تھے۔ ہسپتال کے عملے کا انہیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس بزرگ کے بیٹے اپنے باپ کی تکلیف پر روتے تھے۔ جب تک اُس کا زخم ٹھیک نہیں ہوا سب ہسپتال میں رہے اور ایک میں تھا۔ میرے پیچھے میرے دُکھ میں ساتھ دینے کے لیے میرا کوئی بھائی نہیں آیا تھا۔ اور وہ آتے بھی کیسے میں کون سا کبھی کسی کے غم میں شریک ہوا تھا۔ میرا دل کٹ جاتا تھا جب کوئی مجھ سے پوچھتا تھا کہ تمہاری خبر لینے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

میں تقریباً ڈیڑھ ماہ تک ہسپتال میں رہا۔ رمضان کا مبارک مہینہ ختم ہونے والا تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے خوشخبری سنائی تھی کہ آپ کی بیٹی اب تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہے عید آپ اپنے گھر پر منائیں گے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ عید سے ایک دن پہلے ہمیں چھٹی مل گی۔ میری بیٹی جسے میں نیم مردہ حالت میں ہسپتال لایا تھا۔ اب وہ صحت مندی کی وجہ سے کلکاریاں مار رہی تھی اور اُسے دیکھ دیکھ کر میرا دل بہت خوش تھا۔ میں ڈیڑھ سال کے بعد گھر واپس لوٹا تھا۔ پڑوسی خبر لینے آئے تھے، لیکن میرے بھائی مجھ سے لاتعلق ہی رہے۔

میں نے اپنی امی کو غم کے عالم میں دیکھا۔ میں پچھلے پانچ سالوں سے انہیں اسی عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اُن کا دُکھ رمضان کے مہینے میں بہت بڑھ جاتا تھا۔ روزہ اور نماز مومن کا دل نرم

کر دیتے ہیں۔ یہ کیسے مسلمان تھے۔ جو روزے رکھتے تھے، نماز پڑھتے تھے، عبادت کرتے تھے، لیکن اُن کا دل نرم نہیں پڑتا تھا۔ زندگی تو محبت کا پیغام پھیلانے کے لیے کم ہے۔ نہ جانے لوگ اس مختصر زندگی میں نفرت کے لیے وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں۔ پیار کی، سلوک کی مثال پانی جیسی ہے۔ پانی پینے کے قابل نہ بھی ہو تب بھی آگ بجھانے کے قابل ضرور ہوتا ہے۔ یہ میری امی کا خیال تھا۔

"امی جان! آپ کے لئے عید کا کیا تحفہ لاؤں؟" میں نے امی جان سے پوچھا۔

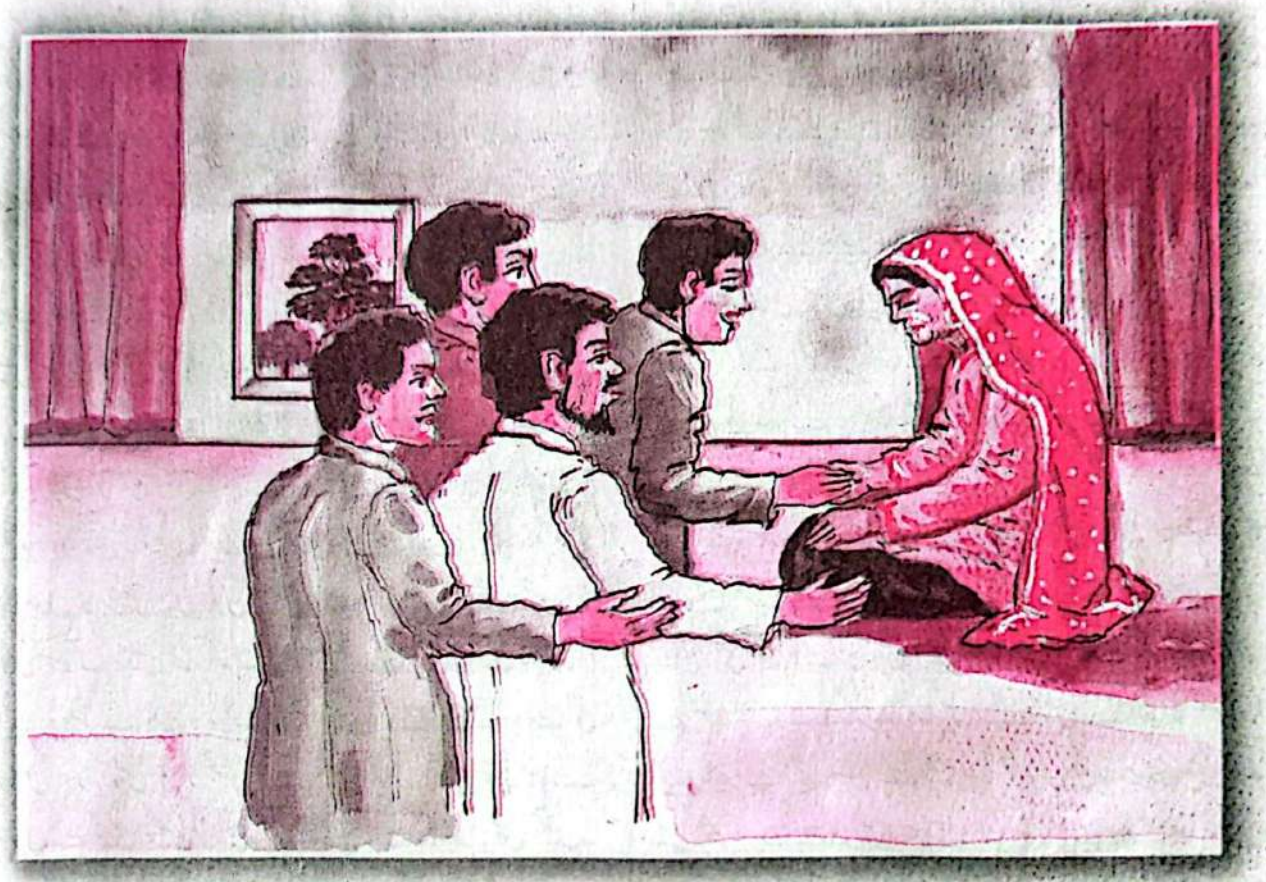

"کیا خوشی لا سکتے ہو؟" پھر وہ رو پڑیں۔ میرا سر جھک گیا۔

عید پیار کا دن ہے..... سلوک کا دن ہے۔ پیار نہیں سلوک نہیں تو عید کا دن ایک عام سا دن ہے۔ اور عام سے دنوں کی طرح یہ دن بھی گزر جائے گا۔ میرے دل کا عالم عجب سا ہو رہا تھا۔ میں امی اور ابو کے راستے پر چلنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک جذبہ تھا جو مجھے قدم بڑھانے سے روک رہا تھا۔

غرور اور انا میں بال برابر فرق ہوتا ہے۔ انا انسان کی طاقت ہے جو اُسے آسمان تک لے جاتی ہے اور غرور کمزوری جو اُسے پستی کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ جذبہ غرور تھا جو مجھے پہلا قدم اٹھانے سے روک رہا تھا۔ مجھے اب پستی کے گڑھے سے نکلنا تھا۔ شام ہوئی اور پھر شور بلند ہوا۔

"چاند نظر آگیا..... چاند مبارک ہو....."

میں دوڑ کر امی کے پاس پہنچا:

"امی..... امی مبارک ہو چاند نظر آگیا....."

امی نے سر جھکا لیا۔ میں نے اُن کی آنکھوں میں تیرتے آنسو دیکھ لیے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر پوچھا:

"امی آپ کے لیے کیا لاؤں.....؟"

"کیا خوشی لا سکتے ہو؟" امی بولیں۔

"ہاں لا سکتا ہوں....." میں رو پڑا۔ امی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

آج بہت دنوں بعد مجھے سکون ملا تھا۔ پھر میں نے اپنے آنسو صاف کیے اور اب خوشی اپنے گھر میں لانے کے لیے میں پہلا قدم اٹھانے کے لیے تیار تھا۔

میں اپنے کمرے میں سے باہر نکلا اور ڈیوڑھی میں چلا آیا۔ یہاں سے مجھے چار راستے نظر آرہے تھے۔ ایک راستہ میرے گھر کو جاتا تھا۔ باقی تین راستے میرے بھائیوں کے گھروں کو جاتے تھے۔ میں نے آج تک ان راستوں پر قدم نہیں رکھا تھا، لیکن آج مجھے ان راستوں پر چلنا تھا۔ میں نے پہلا قدم آگے بڑھایا۔ یہ راستہ میرے سب سے بڑے بھائی کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ گلی عبور کر کے میں چھوٹے سے صحن میں پہنچا تو میں نے دیکھا۔ میرا بڑا بھائی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ میں دبے پاؤں اُس کے قریب پہنچا اور بولا:

"بھائی جان..... چاند مبارک ہو....."

میری آواز سن کر بھائی نے چونک کر سر اُوپر اٹھایا اور پھر اُن کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

"اتنی دیر سے آئے ہو چھوٹے۔"

"آپ تو آئے ہی نہیں آئے" آنسو دوبارہ میری آنکھوں سے جاری ہو گئے تھے۔

کوئی شکوہ کوئی شکایت کیے بغیر دلوں کے سارے میل دھل گئے تھے۔ اور ہم دونوں بھائی گلے مل کر آنسو بہا رہے تھے۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ دُوسرے دونوں بھائیوں کی طرف بھی عید کی مبارک باد دینے جانا ہے۔" میں نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں....." میں مسکرانے لگا۔ یہ دُوسرا قدم تھا۔ میں امی کے لیے خوشی لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ہم چاروں بھائی سلوک کی دولت حاصل کرنے میں کام یاب ہو چکے تھے۔ اور آج حقیقی معنوں میں عید کی خوشیاں ہمارے گھر اتر آئی تھیں۔ اور اب میں اس لمحے کا منتظر تھا جب ایک عرصے کے بعد ہم سب بھائی کندھے سے کندھے ملا کر عید کی نماز ادا کریں گے۔

---☆☆---

معلوماتِ عامہ

☆ پاکستان کا بلند ترین پہاڑ کے ٹو ہے جو سطح سمندر سے 8611 میٹر بلند ہے۔
☆ پاکستان آم پیدا کرنے والا دُوسرا بڑا ملک ہے۔
☆ عمارتوں کا شہر نیویارک کو کہا جاتا ہے۔
☆ سات پہاڑوں کا شہر روم کو کہا جاتا ہے۔
☆ لال عمارتوں کا شہر جے پور کو کہا جاتا ہے۔
☆ خوشبوؤں کا شہر پیرس کو کہا جاتا ہے۔
☆ ٹھگوں کا شہر بنارس کو کہا جاتا ہے۔
☆ گلابوں کا شہر شیراز کو کہا جاتا ہے۔
☆ شاہینوں کا شہر سرگودھا کو کہا جاتا ہے۔
☆ ایشیاء کا مانچسٹر فیصل آباد کو کہا جاتا ہے۔
☆ مراکش کی کرنسی کا نام درہم ہے۔
☆ کویت کی کرنسی کا نام کویتی درہم ہے۔
☆ بھارت کی کرنسی کا نام روپیہ ہے۔
☆ ترکی کرنسی کا نام لیرا ہے۔
☆ جاپان کی کرنسی کا نام ین ہے۔
☆ عراق کی کرنسی کا نام دینار ہے۔
☆ سب سے زیادہ خام تیل سعودی عرب میں پایا جاتا ہے۔
☆ سب سے زیادہ نمک پاکستان میں پایا جاتا ہے۔
☆ سب سے زیادہ تانبا چلی میں پایا جاتا ہے۔
☆ سب سے زیادہ سونا اور سرمہ جنوبی افریقہ میں پایا جاتا ہے۔
☆ سب سے زیادہ کوئلہ چین میں پایا جاتا ہے۔

(اسد عباس، گوجرانوالہ)

میرے پسندیدہ اشعار

آپ کے پسندیدہ اشعار پر مبنی "تعلیم و تربیت" کا لیا دل جسپ سلسلہ

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دُور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دُور
(دانیال احمد، کراچی)

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
(ارسلان شفیق، ملتان)

مِل جُل کے ہم ترانے حبِ وطن کے گائیں
بلبل ہوں جس چمن کے گیت اُس چمن کے گائیں
(عروج فاطمہ، لاہور)

چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن ، خدا کی شان ہے
(سخی حسین، جھنگ)

گلے تو ملتے ہیں احباب اے حیاؔ اب بھی
مگر دلوں میں صداقت کی بو نہیں باقی
(رحمت اللہ، بھکر)

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا
(عمیر احمد، سرگودھا)

بلبل کو پیار باغ سے کوئل کو بن سے پیار
کیوں کر نہ آدمی کو ہو اپنے وطن سے پیار
(نازش بتول، کراچی)

وطن پر جان دینے کی جو خو ہو نوجوانوں میں
بہاریں پھر سے لوٹ آئیں وطن کے گلستانوں میں
(سعدیہ شکیل، لاہور)

تعمیر کی ہر اینٹ پہ لکھا ہے میرا نام
دیوار مگر آپ سے منسوب ہو گئی
(حافظ محمد ممتاز، چکوال)

تمام شب مجھے تکتے رہے درو دیوار
اک اجنبی کی طرح میں خود اپنے گھر میں رہا
(ام کلثوم، لاہور)

تنگ آ کے ہم جو بیچنے نکلے وفا ضیاءؔ
بازار نے خلوص کے بھاؤ گرا دیئے
(سمیرا سحر، پاک پتن)

ٹھوکریں کھا کے آتا ہے خیال
ہم بھی چل سکتے تھے آنکھیں کھول کر
(ندا آصف، تربیلا)

جلا نہ اتنے دیئے میری راہ گزاروں میں
مقام بھول کے راہوں سے پیار ہو جائے
(سلطان محمد ناصر، لورالائی)

جس شخص کو کانٹوں سے الجھنا نہیں آتا
حاصل اُسے پھولوں کی قبا ہو نہیں سکتی
(محمد عرفان ریاض، شور کوٹ)

جن دوستوں سے ہم کو توقع وفا کی تھی
وہ دوست دل سے نقشِ وفا ہی مٹا گئے
(مبشرہ احمد، لاہور)

جن کو سمجھ رہے تھے ہم دوستی کے پھول
ہاتھوں میں چبھ گئے وہی خار کی طرح
(محسن شہیر احمد، ایبٹ آباد)

جلتی ہے کتنی دیر ہواؤں میں میرے ساتھ
اِک شمع پھر میرے لئے روشن ہوئی تو ہے
(حفصہ شہاب، کوہاٹ)

جسے ہوتا نہیں احساس اوروں کی مصیبت کا
وہ اِک پتھر تو ہو سکتا ہے لیکن دل نہیں ہوتا
(محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
(آصف نذیر، جہلم)

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے
(کمیل علی خان، جھنگ صدر)

راہ دشوار سہی ، عزمِ سفر پیدا کر
حوصلہ خود ہی تیرا رہبرِ منزل ہو گا
(عاقب رباب، چکوال)

لگی ہے آگ مکانوں میں اور مکینوں میں
چھڑی ہے بحث کہ اس آگ کو بجھائے کون
(مائرہ علی، راول پنڈی)

ہم کو طوفان سے لڑنے کا ہنر آتا ہے
آپ ساحل پہ کھڑے ہو کہ تماشا دیکھیں
(سلمٰی صفی، ثمن)

تاریخ کی گھڑیوں نے وہ دور بھی دیکھے ہیں
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی
(عالیہ ارم، سکھر)

آسانیوں سے نہ پوچھ منزل کا راستہ
اپنی راہ میں سفر کے پتھر تلاش کر
(نازیہ نذیر، مصطفیٰ آباد)

ہوا کے شور میں برگ و شجر یہ کہتے ہیں
یہی خزاں کبھی قرضِ چمن اُتارے گی
(محمد جعفر، گروٹ)

چچا تیز گام نے افطاری کی

محمد نعیم عالم (لاہور)

چچا تیز گام بے چینی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ وہ ٹہلنے کے ساتھ ساتھ اپنے سر کو بھی زور زور سے ہلا رہے تھے جس سے اُن کی ٹوپی کا پُھندنا کسی مداری کی ڈگڈگی کی طرح اِدھر اُدھر پھدک رہا تھا۔ چچا تیز گام کمرے کے ایک کونے سے دُوسرے کونے کی طرف چکر لگا رہے تھے۔ اُن کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ مارے غصے سے اُن کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ آج چچا تیز گام کو ایک افطار پارٹی پر جانا تھا۔ افطار پارٹی اُن کے دوست مبین میاں کے ہاں تھی۔ اُن کا گھر شاداب کالونی میں تھا جو چچا تیز گام کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ مبین میاں نے چچا تیز گام کو دعوت کیا دے دی وہ تو ہواؤں میں اڑنے لگے تھے۔ وہ خوشی کے مارے پھول کر کپا ہو گئے تھے۔

یہ دعوت مبین میاں نے چچا تیز گام کو دی نہیں تھی بلکہ انہوں نے خود لی تھی۔ کل چچا تیز گام شبراتی حلوائی کی دُکان کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ انہیں مبین میاں شبراتی حلوائی سے باتیں کرتے نظر آئے۔

"ٹھیک ہے..... شبراتی..... ذرا دھیان سے..... دو سو سموسے..... اور دس کلو پکوڑے، ذرا اچھے سے انداز میں بنانا، ہاں..... ہاں میں افطاری سے کچھ دیر پہلے لے جاؤں گا۔" مبین میاں کے یہ الفاظ چچا تیز گام کے کانوں میں پڑے تو اُن کے کان کھڑے ہو گئے۔ چچا تیز گام اُن کی طرف لپکے۔ "ارے..... بھئی..... چپکے چپکے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

چچا تیز گام انجان سے بن کر بولے۔

"آؤ..... آؤ چچا تیز گام۔ وہ کل گھر میں افطار پارٹی ہے اس کے لیے میں شبراتی کو سموسوں اور پکوڑوں کا آرڈر دے رہا تھا۔ مبین میاں چچا تیز گام کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"ارے مبین میاں ہمیں نہیں بلاؤ گے۔ افطار پارٹی میں، اکیلے ہی اکیلے روزہ افطار کرو گے!" چچا تیز گام مصنوعی خفگی سے بولے۔

"ارے چچا تیز گام افطار پارٹی میں اگر آپ کو نہیں بلائیں گے تو بھلا کس کو بلائیں گے۔ آپ کے بغیر افطار پارٹی کا خاک مزہ آئے گا۔ آپ تو افطار پارٹی کے مہمان خصوصی ہوں گے مہمانِ خصوصی۔" مبین میاں خوشامدانہ انداز میں بولے۔

"واہ..... بھئی..... واہ..... بہت خوب مہمان خصوصی۔ اور

وہ بھی ہم..... پھر تو ہم پوری آن بان شان سے آئیں گے، ہم ابھی سے تیاری شروع کر دیتے ہیں۔"

چچا تیز گام اکڑ کر بولے۔ چچا تیز گام ابھی گھر کی طرف روانہ ہونے ہی والے تھے کہ مبین میاں بولے:

"ارے ارے چچا تیز گام یاد رکھئے گا..... افطار پارٹی کل ہے..... آج نہیں....." مبین میاں کو خطرہ تھا کہ چچا تیز گام اپنی تیزی کی وجہ سے کبھی آج ہی نہ ٹپک پڑیں۔

"اچھا، اچھا ہمیں یاد ہے اب ہم اتنے بھی تیز گام نہیں۔"

چچا تیز گام بُرا سا منہ بنا کر بولے اور تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گھر کی طرف چل دیئے۔

"بیگم..... او..... بیگم....." چچا تیز گام زور زور سے چلاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"کیا ہوا ہے؟ کیا مصیبت آن پڑی ہے جو یوں چلا رہے ہو۔" باورچی خانے سے بیگم کی جھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"مصیبت نہیں..... بیگم افطار پارٹی آن پڑی ہے۔ افطار پارٹی..... وہ اپنے مبین میاں ہیں نا، ارے وہی جو شاداب کالونی میں رہتے ہیں۔ اُن کے ہاں کل افطار پارٹی ہے..... پتہ ہے..... بیگم..... انہوں نے افطار پارٹی کی دعوت دیتے ہوئے کیا کہا تھا۔" چچا تیز گام تیز تیز بولتے چلے گئے۔

"مجھے کیا پتہ..... کیا کہا تمہارے مبین میاں نے۔ پتہ نہیں کون ہیں یہ مبین میاں۔ کھانے کے لئے تو تم ہر ایرے غیرے سے واقفیت نکال لیتے ہو۔"

بیگم جلے کٹے لہجے میں بولی۔

"کیا کہا.....؟ ایرا غیرا۔ اماں جاؤ، مبین میاں کوئی غیر نہیں، اپنا یار ہے جگری یار..... جبھی تو انہوں نے کہا تھا چچا تت..... نہیں..... تنویر احمد آپ تو افطار پارٹی کے مہمانِ خصوصی ہوں گے..... مہمانِ خصوصی"

"مہمانِ خصوصی اور آپ۔" گھریلو ملازمین جمن جو کافی دیر سے خاموش تھا، حیرت سے چچا تیز گام کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ مہمانِ خصوصی ہوں گے؟"

"کیوں..... کیا ہم مہمان خصوصی نہیں ہو سکتے۔" چچا تیز گام نے آنکھیں نکالیں۔

"ہو سکتے ہیں..... حضور..... ہو سکتے ہیں۔ مہمانِ خصوصی تو کیا آپ سب کچھ ہو سکتے ہیں۔" جمن جلدی سے بولا۔

"ہاں تو بیگم صاحبہ ہم افطار پارٹی میں مہمانِ خصوصی ہوں گے اس لیے ہماری تیاری بھی تو خصوصی ہونی چاہیے۔ بقیہ تیاری تو ہم کل کریں گے۔ بیگم تم سے تو ہم یہی کہنے آئے ہیں کہ ہمیں سحری کے وقت اٹھا دینا۔ اب بغیر روزہ رکھے افطار پارٹی کے مہمانِ خصوصی بنتے کیا ہم اچھے لگیں گے۔"

"تو یوں کہو کہ افطار پارٹی کے لیے روزہ رکھو گے۔"

بیگم ہاتھ نچا کر بولیں۔

"بیگم تم کچھ بھی کہو۔ خیر کل تو ہم روزہ ضرور رکھیں گے۔ اس بلا کی پڑتی ہوئی گرمی میں ہم سے پیاس برداشت نہیں ہوتی۔ ہمارا معدہ کھانے سے اتنی لمبی جدائی برداشت نہیں کر سکتا، لیکن اب ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ ایک روزہ بھی نہ رکھ سکیں۔" چچا تیز گام بُرے بُرے سے منہ بناتے بولتے چلے گئے۔

وہ دن تو جیسے تیسے گزر گیا۔ رات کو چچا تیز گام خواب میں بھی سموسے، پکوڑے اور دہی بڑے کھاتے رہے۔

سحری کے وقت جب سارا گھر چچا تیز گام کے خراٹوں سے گونج رہا تھا تو ان کی بیگم نے انہیں جگایا:

"محمود کے ابا..... اب اٹھ بھی جاؤ۔" اس مرتبہ ان کی بیگم نے ان کو زور سے جھنجوڑا۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ دو تین مرتبہ چچا تیز گام کو اٹھا چکی تھیں، لیکن وہ چچا تیز گام ہی کیا جو ایک بار کے اٹھانے سے اٹھ جائیں۔ خیر اللہ اللہ کر کے چچا تیز گام اٹھے اور سحری کی۔

نمازِ فجر کے فوراً بعد ہی گھریلو ملازمین جمن اور استاد کی شامت آگئی۔

"ارے جمن..... او..... جمن ذرا دوڑ کے میرے پاس آؤ۔ ارے..... اُستاد تم بھی آؤ۔"

"جی حضور!"

"جمن یہ میرے جوتے لے جاؤ اور بدھو موچی کے پاس

سے پالش کروا لاؤ اور سنو! بدھو موچی سے کہنا پالش ذرا "بڑھیا قسم کی لگائے۔" چچا تیز گام نے جمن کو جوتے تھمائے اور پھر استاد کو کہا:

استاد! میری شیروانی جمعہ خان دھوبی سے استری کروا لاؤ۔

"جی حضور!" استاد بولا۔

جمن اور استاد سوچ رہے تھے کہ اِس کے بعد اُن کی چھٹی ہو جائے گی، لیکن چچا تیز گام بھلا اتنی جلدی کہاں چھٹی دینے والے تھے۔ دن میں تقریباً دس مرتبہ تو جمن کو جوتے پالش کروانے کے لئے بھجوایا اور اتنی ہی مرتبہ استاد کی شامت آئی۔ تب کہیں جا کر چچا تیز گام کو جوتوں کی پالش اور اچکن کی استری پسند آئی۔ چچا تیز گام ابھی تیزی سے شیروانی پہن ہی رہے تھے اُن کی بیگم کمرے میں داخل ہوئے ہوتے بولی:

"ارے اتنی بلا کی پڑتی ہوئی گرمی میں شیروانی پہننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لو بھئی..... اور سنو! اری بیگم..... شیروانی تو ہماری پہچان ہے۔ اور جو قومیں اپنی پہچان کو پسِ پشت ڈال دیتی ہیں وہ کبھی ترقی نہیں کرتیں۔"

چچا تیز گام نے کسی مقرر کی طرح اکڑ کر کہا اور تیزی سے اچکن پہننے لگے، لیکن یہ کیا جیسے ہی انہوں نے شیروانی پہننے کے لئے اپنا سر شیروانی میں ڈالا۔ ان کا سر پھنس کر رہ گیا۔ کیونکہ انہوں نے جلدی میں اپنا سر بازو میں ڈال دیا تھا۔ پھر بڑی مشکل سے انہوں نے اپنا سر بازو میں سے نکالا۔ اب شیروانی پہن کر وہ جلدی جلدی بٹن بند کرنے لگے تو بٹن ٹوٹ گیا۔ بٹن ٹوٹنے پر چچا تیز گام بوکھلا گئے۔

"جمن..... او جمن..... غضب خدا کا اس نگوڑے مارے بٹن کو بھی آج ہی ٹوٹنا تھا، جاؤ شیدی ماسٹر سے بٹن لگوا لاؤ اور ذرا جلدی آنا ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکے ہیں"

"جمن کہہ کر تو یہ گیا تھا کہ بس چچا تیز گام میں یوں گیا اور یوں آیا۔ لیکن وہ کافی دیر گزرنے پر بھی نہ آیا تھا۔ اب چچا تیز گام اُس کے انتظار میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ آخر کافی دیر بعد جمن ہانپتا ہوا نمودار ہوا۔

"کہاں مر گیا تھا؟"

"وہ..... کتے....." جمن میاں نے کہنا چاہا۔ لیکن چچا تیز گام نے جلدی سے اُس کی بات اچک لی۔

"کیا مطلب کتے؟" چچا تیز گام غصے میں پھنکارتے ہوئے بولے۔

"میرا مطلب ہے میرے پیچھے کتے لگ گئے تھے۔ اسی لیے میں لیٹ ہو گیا ہوں۔" جمن بولا۔

آخر خدا خدا کر کے چچا تیز گام کی تیاری مکمل ہوئی۔ اور وہ پوری آن بان شان کے ساتھ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے افطار پارٹی پر جانے کے لئے گھر سے چل پڑے، لیکن یہ کیا جیسے ہی چچا تیز گام گھر سے باہر نکلے بوندا باندی شروع ہو گئی۔

"ارے..... اس بارش کو بھی آج ہی ہونا تھا۔ استاد او استاد ذرا بھاگ کر جا..... میرے کمرے سے چھتری تو اٹھا لا۔" چچا تیز گام نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہانک لگائی۔ "میں کہتی ہوں بارش میں افطار پارٹی میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" ان کی بیگم بولی۔

"بیگم! کیا بات کرتی ہو اگر مہمان خصوصی ہی نہ گیا تو پارٹی کیا خاک ہو گی۔"

اتنے میں استاد چھتری لے آیا۔ چچا تیز گام نے چھتری پکڑی اور جلدی سے گھر سے نکلنے ہی لگے تھے کہ ان کی شیروانی دروازے کے ایک کیل میں الجھ کر رہ گئی۔ اب وہ چچا تیز گام ہی کیا جو سکون سے الجھی ہوئی شیروانی کو سلجھاتے۔ چچا تیز گام نے جو زور سے شیروانی کو کھینچا تو چیڑ کی آواز کے ساتھ شیروانی کا بازو پھٹ گیا۔

اس اچانک افتاد پر چچا تیز گام ایک مرتبہ تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ وہ افطار پارٹی میں جانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ مہمانِ خصوصی کا بھوت پھر اُن کے سر پر سوار ہو گیا۔ سموسے پکوڑے اور دھی بڑے ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ لہٰذا چچا تیز گام ایک نئے جوش و جذبے کے ساتھ پھٹی بازو والی شیروانی پہنے ایک مرتبہ پھر گھر سے چل دیئے۔

بوندا باندی آہستہ آہستہ بارش کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی۔ ہوا بھی تیز چل رہی تھی۔ اب جو ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو چچا تیز گام کے قدم لڑکھڑا گئے۔ کیونکہ چچا تیز گام ٹھہرے اک دھان پان قسم کے آدمی، اب قدم جو لڑکھڑائے تو چھتری اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ہوا میں اڑنے لگی۔ ”میری چھتری..... میری چھتری۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چھتری کے پیچھے ہو لیے..... اب چھتری آگے آگے اور چچا تیز گام پیچھے پیچھے تھے۔ آخر چچا تیز گام نے چھتری کو جا لیا۔ چھتری ابھی تک ہوا میں محوِ پرواز تھی۔ چچا تیز گام نے چھتری کو پکڑنے کے لئے ہوا میں چھلانگ لگائی تو توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ لہٰذا چچا تیز گام چھتری سمیت زمین پر آرہے۔ بارش تیز ہونے کی وجہ سے کیچڑ ہو چکی تھی۔ لہٰذا چچا تیز گام کی شیروانی کیچڑ میں لت پت ہونے کی وجہ سے اُس پر عجیب وغریب نقش ونگار بن گئے تھے۔ چچا تیز گام بھلا کب ان نقش ونگار کو خاطر میں لانے والے تھے۔ چھتری مضبوطی سے تھامے تیزی سے مبین میاں کے گھر کی طرف چل دیئے۔ چچا تیز گام ابھی جا ہی رہے تھے کہ افطاری کا وقت ہونے کا سائرن بج گیا۔ سائرن کا بجنا تھا کہ چچا تیز گام نے مبین میاں کے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ کیچڑ میں وہ بھلا کہاں دوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا جیسے ہی وہ دوڑے اُن کا پاؤں پھسلا، اب چھتری ایک طرف تو چچا تیز گام دُوسری طرف تھے۔ اس مرتبہ چچا تیز گام نے چھتری کی بھی پروانہ کی اور اٹھ کر دوبارہ دوڑ لگا دی۔ چچا تیز گام مبین کے گھر پہنچے تو وہاں افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ سموسوں اور پکوڑوں پر جلدی جلدی ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ چچا تیز گام بھی جلدی سے لوگوں کی بھیڑ میں گھس گئے۔

”ارے کون ہو تم؟ جو یوں منہ اٹھائے چلے آرہے ہو۔“ ایک آدمی ان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ارے ذرا زبان سنبھال کر بات کرو، میں ہوں اس افطار پارٹی کا مہمانِ خصوصی۔“ چچا تیز گام نے اکڑ کر کہا۔

”ارے یہ تو اپنے چچا تیز گام ہیں، چچا تیز گام! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

”مبین میاں! حالت کو چھوڑو..... کچھ کھانے کو دو..... ورنہ تو لگتا ہے چند ہی منٹوں میں سب کچھ چٹ ہو جائے گا۔“ چچا تیز گام جلدی سے بولے اور پاس رکھے سموسوں پر پل پڑے۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

☆☆

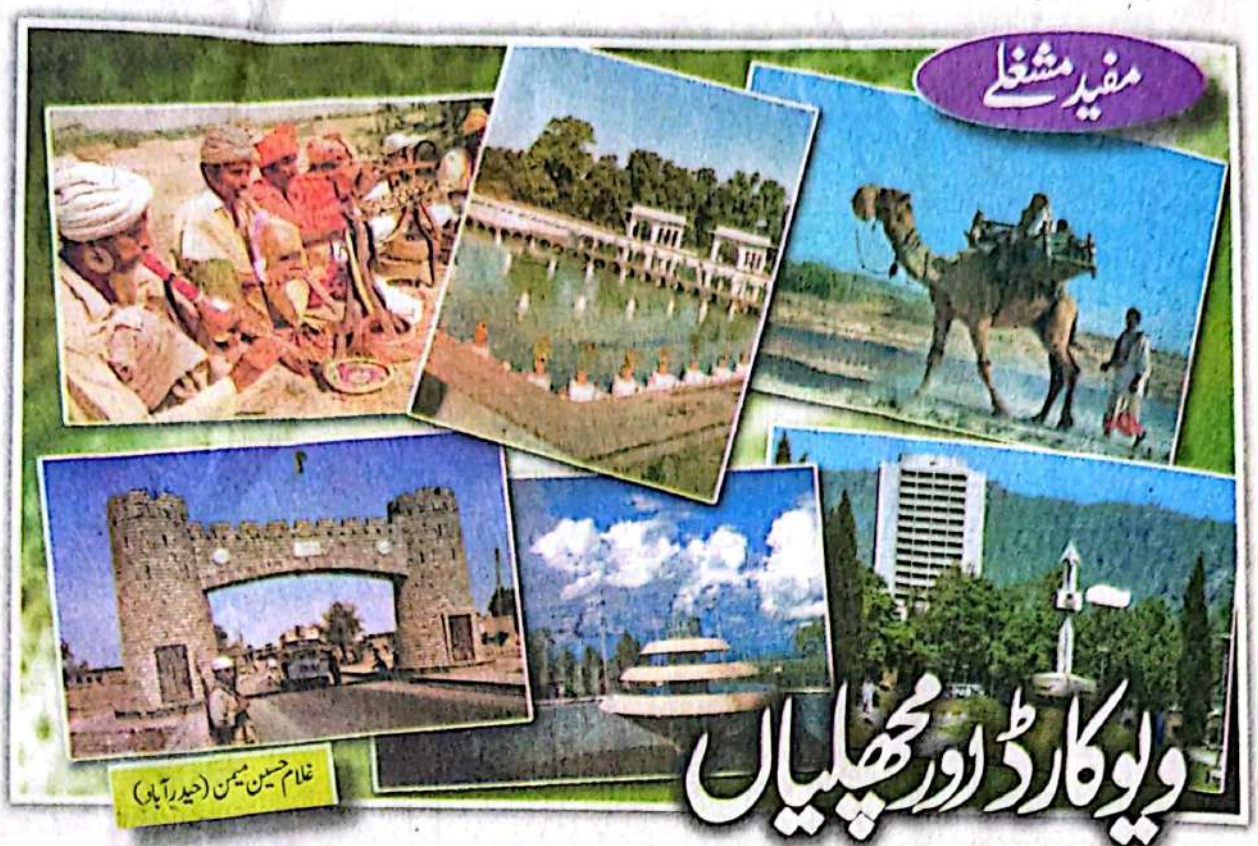

عموماً ہم خط لفافے میں ڈال کر روانہ کرتے ہیں۔ ایک آسان اور سستا طریقہ پوسٹ کارڈ کا ہے جس کے ایک جانب پتہ اور دُوسری جانب خط کا مختصر متن ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تصویری پوسٹ کارڈ بھی ہوتا ہے جسے ویو کارڈ (View Card) کہتے ہیں۔ اسے جمع کرنے کا مشغلہ بھی ہر عمر کے لوگوں میں مقبول ہے۔ یہ ویو کارڈز معلومات کے ساتھ ساتھ یادگار اور سیاحتی مقامات کی تصاویر کے حصول کا بہترین ذریعہ ہیں۔

آپ یقیناً جاننا چاہیں گے کہ دُنیا کا پہلا پوسٹ کارڈ کب جاری ہوا؟ یہ یکم اکتوبر 1869ء کو آسٹریا نے جاری کیا تھا اسے ہر جگہ پسند کیا گیا اور پھر دُنیا کے دیگر ممالک نے بھی ایسے پوسٹ کارڈ جاری کرنے شروع کیے۔ اس کا بنیادی خیال ڈاکٹر ایمونیل ہرمین کا تھا۔ اس کے تین سال بعد دُنیا کا پہلا باتصویر پوسٹ کارڈ جاری ہوا اور اسے جاری کرنے کا سہرا سوئزرلینڈ کے سر رہا۔ سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورخ سے جاری ہونے والے دُنیا کے اس پہلے ویو کارڈ کو "فرانز اورچ" نے تیار کیا تھا۔ اس میں زیورخ کے چار مناظر کی عکاسی کی گئی تھی۔ 1894ء میں برطانیہ سے بھی تصویری پوسٹ کارڈ جاری ہوا۔

تصویری پوسٹ کارڈ کے حوالے سے جو تصاویر زیادہ شائع ہوئیں اُن میں پانی کے جہاز، ٹرانسپورٹ، سیاحتی مقامات کی تصاویر، کھلونے، گڑیا اور فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات شامل تھیں۔ بعد میں سائنسی پیش رفت کی بدولت ایجادات، دریافت اور اہم مقامات کا بھی احاطہ ہونے لگا۔

اس مشغلے کو اختیار کرنے کے لیے آپ خرید کر یا دوستوں سے تبادلہ کر کے یہ کارڈز جمع کرنا شروع کر سکتے ہیں۔ یہ شوق آپ کی علمی استطاعت بڑھائے گا۔ بیرون ملک مقیم آپ کے دوست یا بزرگ بھی آپ کی اس سلسلے میں مدد کر سکتے ہیں اور آپ کو مختلف ممالک میں شائع ہونے والے تصویری پوسٹ کارڈ بھیج سکتے ہیں۔

اسے محفوظ رکھنے کے لیے علیحدہ سے البم رکھا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ یہ شوق مزید معلوماتی اور منفرد ہو سکتا ہے اگر آپ البم میں شامل پوسٹ کارڈ پر شائع ہونے والی تصاویر سے متعلق معلومات مختلف کتابوں اور انسائیکلوپیڈیا سے نکال کر علیحدہ نوٹ بک میں لکھ لیں، یہ آپ کے لیے اور آپ کے دوستوں سمیت دیگر پڑھنے والوں کے لیے ایک مختصر

انسائیکلو پیڈیا بن جائے گا۔

ہم آپ کو آج ایک اور مفید مشغلے کے بارے میں بتاتے ہیں۔ وہ مشغلہ ہے مچھلیاں پالنا۔ ہم اکثر بیشتر گھروں میں مختلف قسم کے پرندوں اور جانوروں کو دیکھتے ہیں۔ یہ مخلوق جہاں آپ کے اطراف میں خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے وہیں آپ کو خالقِ کائنات سے محبت اور اس کی تخلیق پر شکر گزاری کا بھی موقع فراہم کرتی ہے۔

ان پرندوں اور جانوروں میں مچھلیاں پانے کا رجحان زیادہ ہے۔ نقصان نہ پہنچانے والی اور خاموش طبع یہ مخلوق ایک مخصوص قسم کے گھر جسے ماہی خانہ (Aquaram) کہتے ہیں، میں باآسانی رہ سکتی ہیں اور آپ کے گھر یا ڈرائنگ روم کی خوب صورتی میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔

شیشے کا یہ بکس ایک مضبوط قسم کے اسٹینڈ پر رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں صاف پانی اور مچھلیوں کی مناسب خوراک آبی پودے (Water Plants)، مختلف قسم کے پتھر اور مٹی رکھ کر آپ اپنی پسند کی مچھلیوں کا انتخاب کر کے رکھ دیجیے۔ اس سلسلے میں مزید احتیاط، تدابیر اور دیگر معلومات کے لیے اپنے دوستوں اور مچھلیوں کے ڈیلروں سے ضرور مشورہ کیجیے۔

مچھلیوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ یہ ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانوروں میں سب سے نچلے طبقے کا ٹھنڈے خون والا جانور ہے۔ ان کی اب تک بیس ہزار کے قریب چھوٹی بڑی اقسام دریافت ہو چکی ہیں۔ ان میں ایسی مچھلیاں بھی ہیں جو منہ سے قسم قسم کی آوازیں نکالتی ہیں، اور کچھ ایسی مچھلیاں بھی ہیں جنہیں ہاتھ لگائیں تو بجلی کا سا جھٹکا لگتا ہے۔ کچھ مچھلیاں ایسی بھی ہیں جو پانی کے علاوہ خشکی پر بھی رہ سکتی ہیں اور کچھ مچھلیاں درختوں پر بھی چڑھ سکتی ہیں۔ درختوں پر چڑھنے والی ان مچھلیوں کی لمبائی چار پانچ انچ ہوتی ہے۔ ایسی مچھلیاں ایشیاء کے گرم مرطوب ملکوں، آسٹریلیا اور افریقہ کے دلدلی علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے منہ کے قریب دو پنکھ ہوتے ہیں۔ جن سے وہ پانی میں چپوؤں اور خشکی پر پیروں کا کام لیتی ہیں۔

آپ اپنے ماہی خانہ کے لیے مچھلیوں کا انتخاب کرتے وقت خیال رکھیں کہ مچھلیاں آپ کے شہر کی آب وہوا اور ماحول میں باآسانی رہ سکتی ہوں، عام طور پر پاکستان کے شہروں کی آب وہوا معتدل ہے، اس لیے ہمیں ایسی مچھلیوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو معتدل مزاج کی ہوں۔

---☆☆---

☆ایک شخص سمندر میں گر گیا۔ ڈوبتے ڈوبتے اُس کے ہاتھ میں ایک مچھلی آ گئی۔
اُس نے مچھلی کو پکڑ کر باہر پھینکا اور بولا:
"جاؤ تو اپنی جان بچا۔"

(شہزاد عباس، ملتان)

☆ایک آدمی: "میں بہت جلد نہا لیتا ہوں کیوں کہ میں صابن استعمال نہیں کرتا۔"
دُوسرا: "اور میں تم سے بھی پہلے نہا لیتا ہوں کیوں کہ میں پانی استعمال نہیں کرتا۔"

(سحر کومل، کندیاں)

☆ایک انتہائی موٹا آدمی ایک نہایت دبلے پتلے آدمی سے کہتا ہے: "جب تمہیں کوئی دیکھے گا تو کہے گا اس ملک میں قحط ہے۔"
دبلا آدمی جواباً کہتا ہے: "تمہیں دیکھ کر تو لوگ کہیں گے کہ اِس ملک میں قحط کی وجہ تم ہی ہو۔"

(مشہود حسین، پشاور)

☆استاد (شاگرد سے): "انڈے کے فوائد بتاؤ؟"
شاگرد: "جناب ویسے تو انڈے کے بہت سے فائدے ہیں لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر امتحان میں انڈے مل جائیں تو نئی کتابوں کا خرچ بچ جاتا ہے۔"

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

قرضہ دینے والی کمپنی نے اخبار میں اشتہار دیا۔
آپ کیوں پریشان ہیں؟ اپنے دوستوں سے قرض نہ لیں ہم سے لیں۔
آپ کے دوست آپ کو چھوڑ دیں گے، ہم نہیں چھوڑیں گے۔

(لکی شاہد خواج، واہ کینٹ)

☆مریض: "ڈاکٹر صاحب! آپ ہمیشہ میرا الٹا دانت نکال دیتے ہیں۔"
ڈاکٹر: "آج میں صحیح دانت نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"
مریض: "وہ کیسے؟"
ڈاکٹر: "کیوں کہ آپ کے منہ میں صرف ایک ہی دانت بچا ہے۔"

(مروہ شاہد بٹ، سیالکوٹ)

☆ایک فقیر نے دروازے پر صدا لگائی: "آٹا دے دو۔"
اندر سے آواز آئی: "نہیں ہے۔"
اُس نے پھر صدا لگائی: "روٹی دے دو۔" اندر سے آواز آئی: "وہ بھی نہیں ہے۔" فقیر نے چینی مانگی، اندر سے آواز آئی: "وہ بھی نہیں ہے۔"
اُس نے کہا: "ایک روپیہ دے دو۔" اندر سے پھر آواز آئی: "وہ بھی نہیں ہے۔"
فقیر نے صدا لگائی: "پھر تم باہر آؤ اور میرے ساتھ مانگو اندر کیا کر رہے ہو۔"

(جہاں زیب خان، بنوں)

☆استاد: "کل تم سکول کیوں نہیں آئے تھے؟"
شاگرد: "میں گر گیا تھا اور لگ گئی تھی۔"
استاد: "کہاں گر گئے اور کیسے لگی؟"
شاگرد: "میں بستر پر گر گیا اور آنکھ لگ گئی تھی۔"

(زنیرہ سکندر، اسلام آباد)

☆ایک آدمی نے یکے میں جتے ہوئے ایک مریل گھوڑے کو دیکھ کر یکے والے سے پوچھا: "ارے بھائی! تم اس کو کچھ کھلاتے نہیں؟"
یکے والے نے کہا: "کھاتا تو یہ چوبیس گھنٹے ہے۔ اب بوٹی نہ چڑھے تو میں کیا کروں۔ یہ دن بھر دھوپ کھاتا ہے، رات بھر اوس کھاتا ہے، چلتا ہے تو لنگ کھاتا ہے، رکتا ہے تو چابک کھاتا ہے۔ بس یہ چوبیس گھنٹے کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا ہے۔"

(دانیال جاوید، کراچی)

ماں: "بیٹی! تم آنکھیں بند کر کے املی کیوں کھا رہی ہو؟"
بیٹی: "امی جی! میں نے استانی جی سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ املی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گی۔"

(صفورہ اصفی، کراچی)

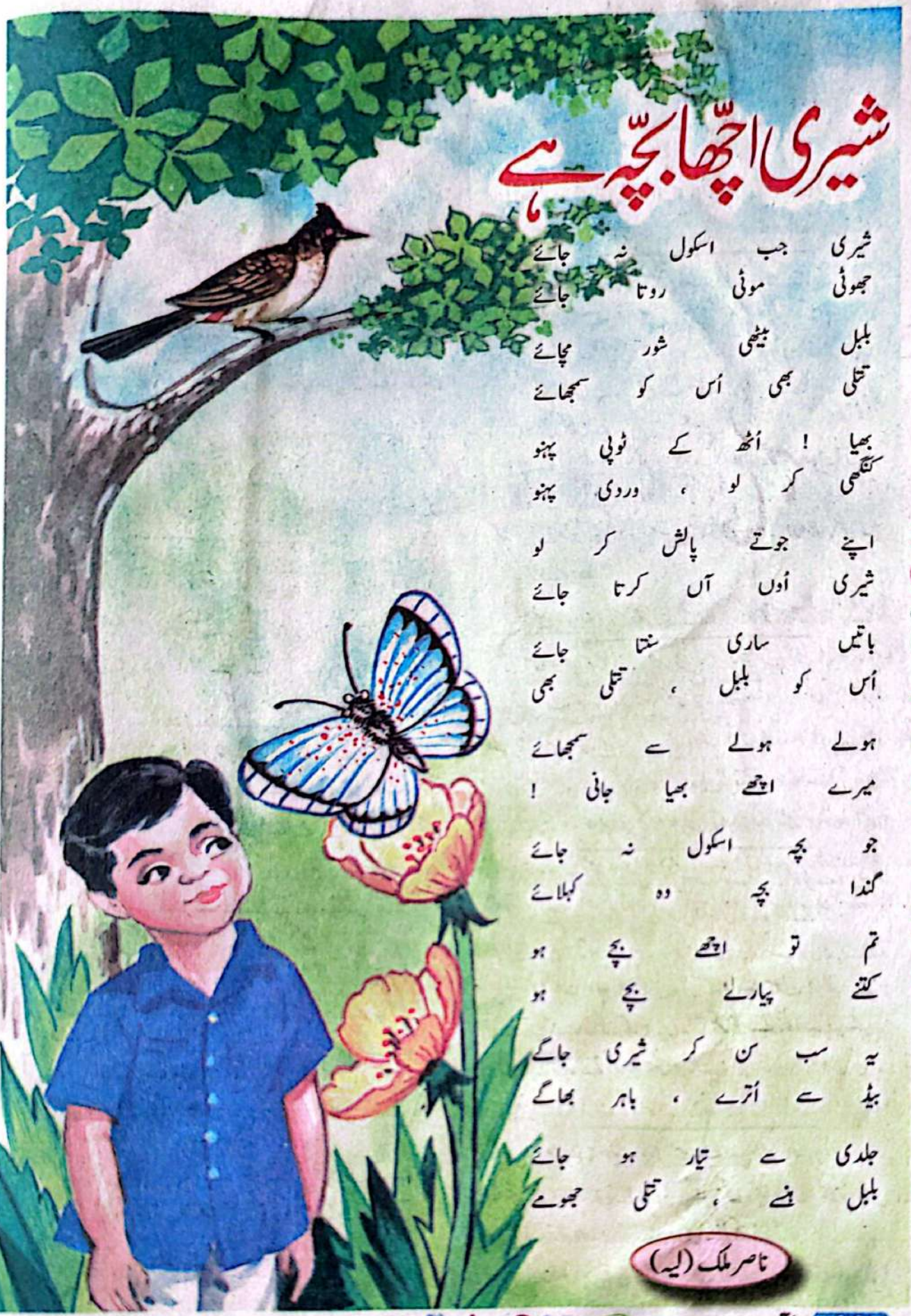

شیری اچھّا بچّہ ہے

شیری جب اسکول نہ جائے
جھوٹی موٹی روتا جائے

بلبل بیٹھی شور مچائے
تتلی بھی اُس کو سمجھائے

بھیا ! اُٹھ کے ٹوپی پہنو
کنگھی کر لو ، وردی پہنو

اپنے جوتے پالش کر لو
شیری اُوں آں کرتا جائے

باتیں ساری سنتا جائے
اُس کو بلبل ، تتلی بھی

ہولے ہولے سے سمجھائے
میرے اچھے بھیا جانی !

جو بچہ اسکول نہ جائے
گندا بچہ وہ کہلائے

تم تو اچھے بچے ہو
کتنے پیارے بچے ہو

یہ سب سن کر شیری جاگے
بیڈ سے اُترے ، باہر بھاگے

جلدی سے تیار ہو جائے
بلبل ہنسے ، تتلی جھومے

ناصر ملک (لیہ)

بکری کی سہیلی

ذیشان بن صفدر، کراچی

ایک بکری تھی۔ وہ بکریوں کے ایک ریوڑ کے ساتھ جنگل میں چرنے کے لیے جاتی تھی۔ جنگل میں پہنچ کر وہ اکیلی ہی اچھے چارے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل جاتی۔ اُسے دُوسری بکریوں سے الگ ہو کر اکیلے گھاس چرنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہ بڑے سکون سے اپنی پسندیدہ جگہ جاکر وہاں کی گھاس چرتی۔ چرواہا اُسے ریوڑ سے الگ ہونے اور اِدھر اُدھر جانے سے روکنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔ اُس کی اِس حرکت سے ریوڑ کی دُوسری بھیڑ بکریاں بھی فکر مند اور پریشان تھیں۔ ایک دن چرواہے نے بکری سے پوچھا: ”بی بکری! تمہیں ریوڑ سے الگ ہو کر اکیلے گھاس چرتے ڈر نہیں لگتا۔“

بکری نے جواب میں کہا: ”بالکل بھی ڈر نہیں لگتا۔“

چرواہے نے یہ جواب سن کر دُوسرا سوال کیا:

”اگر تم اکیلے میں کسی مشکل، کسی مصیبت میں گھر جاؤ تو تمہاری حفاظت کون کرے گا؟“

بکری نے جواب میں کہا:

”میری چار بہنیں ہیں۔ وہ مجھے ہر مشکل سے نکال کر دُور لے جاتی ہیں۔“

”تمہاری وہ چار بہنیں کہاں ہیں جو تمہیں مشکل سے دُور نکال لے جاتی ہیں۔ میں نے تو کبھی انہیں دیکھا نہیں۔“ چرواہے نے کہا۔

”نہیں دیکھا..... حیرت ہے..... وہ تو ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں، لو دیکھو..... میری یہ چار ٹانگیں میری چار بہنیں ہیں۔ یہ مجھے مشکل سے نکال کر ہمیشہ دُور، امن وعافیت کی جگہ پہنچا دیتی ہیں، میرے دو بھائی تو میرے محافظ اور میرے ایسے گارڈ ہیں جو میری حفاظت کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتے ہیں۔ وہ محافظ، وہ گارڈ میرے یہ دو نکیلے سینگ ہیں، پھر یہی نہیں..... میرے دو بھائی ایسے بھی ہیں جو مجھے دُور سے آنے والے خطرے سے بھی آگاہ کرنے کے لئے بالکل ہوشیار رہتے ہیں۔“

”وہ کون سے بھائی ہیں؟“ چرواہے سوال کیا۔

”یہ میرے دو کان ہیں۔“ بکری نے جواب دیا۔

چرواہے نے کہا: ”تمہیں اپنے ان بہن بھائیوں کی مدد پر اتنا یقین اور اس قدر اعتماد ہے۔“

ہاں، کیوں نہیں..... میرے یہ بہن بھائی ہمیشہ میرے ساتھ ہی جو رہتے ہیں..... مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑتے ہیں، میں ان پر بہت اعتماد کرتی ہوں۔“ بکری نے جواب دیا۔

”اگر تم پر کوئی ایسی مشکل ان پڑے جب تمہارے یہ

بہن بھائی تمہاری مدد نہ کر سکیں تو پھر تم کیا کرو گی؟"
چرواہے نے ایک اور سوال بکری کی طرف اچھال دیا۔

بکری بھی جواب دینے میں ماہر تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ بولی:

"میری ایک سہیلی ایسی صورت میں وہ میری مدد کرے گی۔"

تمہاری سہیلی..... وہ کہاں ہے؟ مجھے تو تمہارے آس پاس کوئی سہیلی نظر نہیں آ رہی۔" چرواہے نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے حیران ہو کر کہا۔

"آپ کو میرے گارڈ، میرے محافظ نظر نہیں آئے تو میری سہیلی جو واقعی پردے میں رہتی ہے آپ کو کیسے نظر آ سکتی ہے۔ میری وہ سہیلی میری عقل ہے..... جو دُوسرے لفظوں میں دماغ کہلاتی ہے۔ ایسی صورت میں جب میرے بھائی میری مدد نہ کر سکیں تو میری یہ سہیلی یعنی میری عقل مجھے مشکل یا مصیبت سے نجات دلاتی ہے۔ میری یہ سہیلی اتنی طاقت ور ہے کہ جنگل کا بادشاہ شیر بھی اُس کے سامنے دُم ہلاتا رہ جاتا ہے۔" یہ جواب سن کر چرواہا مزید کوئی سوال نہ کر سکا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے ہر سوال کا بکری کے پاس ٹھوس اور ناقابلِ تردید جواب موجود ہے۔ یہ بکری واقعی بہت چالاک ہے۔ پھر اُس نے دل ہی دل میں سوچا..... کچھ

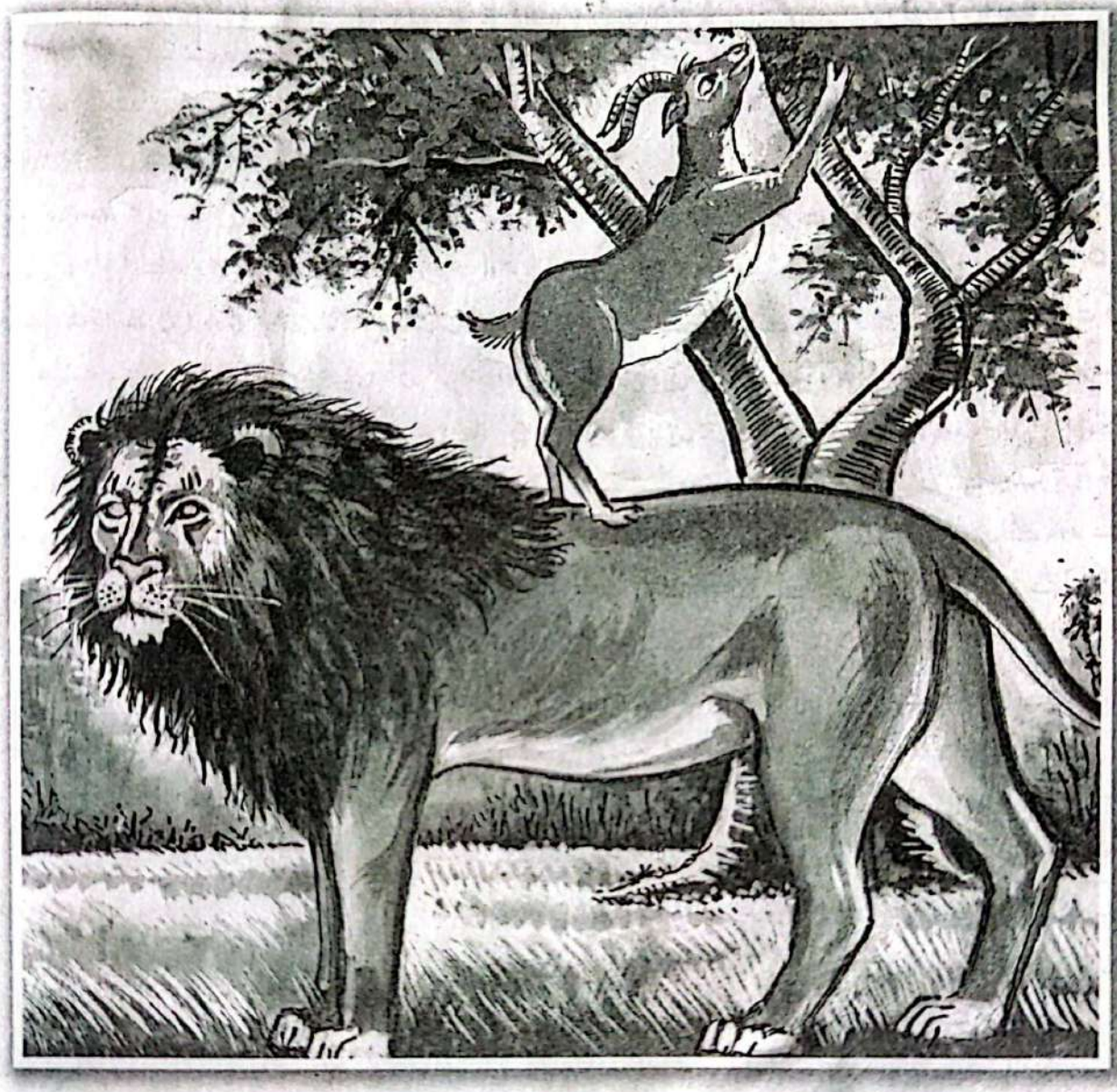

بھی ہو..... آخر ہے تو یہ بکری ہی..... آخر کب تک اپنی خیر منائے گی، کسی دن کوئی شیر مل گیا تو کوئی اس کے کام نہ آسکے گا۔

اچانک ایک دن ایسا ہی ہو گیا۔ بکری گھاس چرتے چرتے جنگل میں دُور نکل گئی۔ ایک جگہ اُس کے کانوں نے اسے بتایا کہ کہیں قریب ہی جنگل کا بادشاہ شیر موجود ہے۔ اُس کی ٹانگوں نے کہا بھاگنے میں خطرہ ہے۔ شیر ایک ہی چھلانگ میں تمہیں دبوچ لے گا۔ مگر اُس کی سہیلی عقل نے سمجھایا..... گھبراؤ نہیں تم شیر سے ڈر کر بھاگنے کے بجائے خود اس کے سامنے پہنچ جاؤ۔

اپنی سہیلی کا یہ مشورہ سن کر بکری شیر کو تلاش کرنے لگی۔ وہ ایک جھاڑی کی آڑ میں کھڑا اُسے نظر آگیا۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتی ہوئی اُس کے سامنے پہنچ گئی۔ بکری کو دیکھتے ہی شیر اُسے دبوچنے ہی والا تھا کہ بکری مسکراتے ہوئے بولی:

"بادشاہ سلامت! جلدی نہ کرو..... میں خود ہی تمہارے پاس آرہی ہوں..... مجھے کھا کر تم اپنی بھوک مٹا لینا..... اتنی جلدی کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔"

شیر نے بکری کی یہ بات سنی..... وہ حیران رہ گیا۔ وہ آگے بڑھ کر بکری کو دبوچنا ہی بھول گیا۔ اور اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُسے اب تک کی زندگی میں ایسی نڈر اور بہادر بکری پہلے نہیں ملی تھی۔ اس سے پہلے کہ شیر اُس سے کوئی سوال پوچھتا، بکری نے کہا:

"عالی جاہ! میں تو خود تمہارے پاس، تمہاری خوراک بننے آئی ہوں..... اسی لئے تو میں بالکل اکیلی ہوں..... میرے ساتھ کوئی اور نہیں ہے..... اب میں زندگی سے اکتا گئی ہوں اور مرنا چاہتی ہوں..... بوڑھی ہونے کی وجہ سے اب میرا مالک مجھے بیکار سمجھنے لگا ہے اور وہ مجھے قصائی کے ہاتھوں فروخت کرنے کا پروگرام بنا چکا ہے۔ بہت ہی خود غرض ہے میرا مالک، میں قصائی کے ہاتھوں ذبح نہیں ہونا چاہتی، بس یہی سوچ کر تمہارے پاس چلی آئی..... بس ایک بات کا مجھے افسوس ہے کہ بوڑھی ہو جانے کی وجہ سے میرے جسم پر گوشت بالکل بھی نہیں رہا..... صرف ہڈیاں ہی رہ گئی ہیں۔ اگر گوشت ہوتا تو تمہارا پیٹ بھی بھر جاتا۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے ساتھ رہوں۔ جنگل میں ہری، ہری گھاس چروں۔ سبز پتے کھاؤں۔ کچھ دنوں میں میری ہڈیوں پر گوشت چڑھ جائے گا پھر تم آرام سے مجھے کھا لینا۔"

شیر نے بکری کی بات مان لی۔ وہ اُس کی تجویز سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ بکری کو ساتھ لے کر اپنے غار کی طرف چل پڑا۔ اُسے درختوں کے پتے کھلانے لگا۔ بکری اُس کی پیٹھ پر چڑھ کر اُونچے درختوں کی شاخوں سے خوب مزے لے لے کر پتے کھاتی۔ شیر سوچتا، اس طرح گھاس اور سبز ملائم پتے کھا کر بکری کے لاغر بدن پر گوشت چڑھ رہا ہے۔ جلد ہی یہ موٹی ہو جائے گی تو میں اِسے کھالوں گا، وہ بکری کی دُوسرے جنگلی جانوروں سے حفاظت بھی کرتا۔ بکری بے خوف اور آزاد فضا میں چرتی، وہ پتے کھاتی موٹی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن بکری شیر کو لے کر گھنے جنگل میں گئی۔ وہ دراصل وہ کسی دُوسرے شیر کی تلاش میں تھی۔ جلد ہی اُسے ایک خوفناک شیرنی نظر آگئی وہ دوڑتے ہوئے اُس کی طرف بھاگی اُسے بھاگتے دیکھ کر شیر بھی دوڑا۔ شیرنی بکری پر جھپٹی اور شیر اس شیرنی پر، دونوں ایک دُوسرے پر جھپٹے اور بکری ان دونوں کی آپس میں لڑائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے موقع دیکھ کر وہاں سے نکل بھاگی۔

شیر اور شیرنی آپس میں لڑتے ہوئے کافی زخمی ہو گئے تھے۔ تھکن نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ شیرنی زخموں کی تکلیف سے کراہتی ہوئی اپنے غار میں چلی گئی..... اب شیر نے بکری کی طرف دیکھا وہ اُسے کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اب شیر کو اپنی بے وقوفی پر دل ہی دل میں افسوس ہونے لگا۔ یوں بکری کی سہیلی عقل نے اُسے شیر کی خوراک بننے سے بچا لیا تھا۔

☆☆

ڈاکٹر طارق ریاض خان (لاہور)

سلائی مشین

دُنیا میں شاید کوئی ایسا گھر ہو جہاں کپڑے سلائی کرنے والی مشین یعنی سیونگ مشین (Sewing Machine) نہ ہو۔ 18ویں صدی تک لوگ ہاتھوں سے کپڑے سلائی کیا کرتے تھے، اُس وقت سوئی موجود تھی جس میں دھاگہ پرو کر کپڑے سینے اور مرمت کرنے کا کام کیا جاتا تھا۔ 1790ء میں Thomas Saint نامی شخص نے پہلی مرتبہ کپڑے سلائی

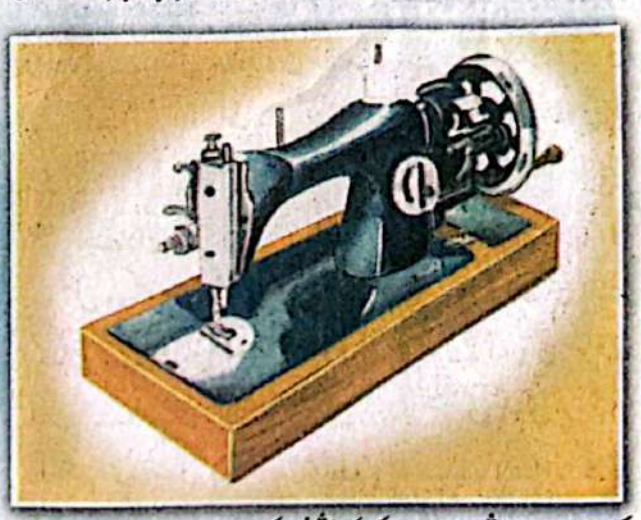

کرنے والی مشین بنانے کی کوشش کی۔ بعدازاں 1830ء میں فرانس کے ایک درزی نے بھی مشین بنا ڈالی۔ اُس کا نام Barthelemy Thimonnier تھا۔ تاہم 1846ء میں Elias Howe نامی امریکن سائنس دان نے نہایت کار آمد اور عمدہ سلائی مشین تیار کر ڈالی۔ اس مشین کو 10 ستمبر 1846ء کو رجسٹرڈ کر لیا گیا اور یوں سلائی مشین مارکیٹ میں آگئی۔ پھر یہ مشین تجارتی پیمانے پر استعمال ہونے لگی۔ گھریلو صارفین کے لیے سلائی مشین بنانے کا سہرا بوسٹن کے مشین مین ISAAC M. SINGER کے سر سجا۔ 1851ء میں یہ مشین متعارف ہوئی اور آج دُنیا بھر میں کپڑے سلائی کی مشین اسی مشین کی ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔

چائے

اگر یہ کہا جائے کہ آج دُنیا میں سب سے زیادہ پیا جانے والا "مشروب" چائے ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کیا بچہ، کیا بڑا سبھی اسے پیتے ہیں بلکہ کچھ لوگ تو چائے پی پی کر جیتے ہیں۔ چائے کی پتی جس پودے کے پتوں کو سوکھا کر تیار کی جاتی ہے اس کا نام Camellia Sinensis ہے۔ یہ چائنہ کا مقامی پودا ہے۔ جسے اب دُنیا بھر میں کاشت کیا جاتا ہے۔

دُنیا میں چائے کی سات اقسام کاشت کی جاتی ہیں۔ جن میں سفید، پیلی، سبز، اولونگ کالی اور پورہ شامل ہیں۔ اب ہربل ٹی (Herbal Tea) بھی دستیاب ہے۔ چائے میں فلورائیڈز اور کیفین (Caffeine) پائی جاتی ہے۔ کیفین ہمارے حسی سیلز کو متحرک کر دیتی ہے۔ چائے میں کیفین کی موجودگی کو سب سے

پہلے F.F. Runge نامی جرمن سائنس دان نے دریافت کیا تھا۔ چائے میں ایک عنصر ٹینن پایا جاتا ہے جو صحت کے لئے مضر اور خوراک کے ہضم کرنے میں حائل ہوتا ہے، بھوک کم کرتا ہے اور قبض کا سبب بنتا ہے۔ یہ پانی کے گرم ہونے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اس میں حل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ زیادہ دیر تک چائے کو اُبالنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ 2008ء کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں 7 کھرب ڈالر کی چائے استعمال کی گئی۔ چائے کی پیداوار کے لحاظ سے اسلامی ممالک میں ترکی پہلے، انڈونیشیا دُوسرے، ایران تیسرے اور

بنگلہ دیش چوتھے نمبر پر آتے ہیں۔

چھپکلی

کچھ لوگوں کو چھپکلی دیکھ کر جھرجھری سی آجاتی ہے۔ اس جانور کا تعلق رینگنے والے گروہ سے ہے جنہیں رپٹائلز (Reptiles) کہا جاتا ہے۔ ان کی 3800 اقسام دریافت ہو چکی ہیں۔ ان میں سے صرف Komodo Dragon نامی چھپکلی انسان کو ہلاک کرسکتی ہے۔ یورپ و امریکہ میں Padarcis Muralis اور پاکستان و بھارت میں Acantho Dactylus Cantoris نامی چھپکلیاں در و دیوار پہ دکھائی دیتی ہیں۔ پاکستانی چھپکلی کی لمبائی 2.75 انچ جبکہ یورپی چھپکلی 20 سینٹی میٹر تک ہو سکتی ہے۔ چھپکلیاں انڈے چھپا کر دیتی ہیں لیکن اُن کی پروا نہیں کرتیں۔ دُنیا کی سب سے بڑی چھپکلی انڈونیشیا میں پائی جاتی ہے۔ اِس کو موڈو ڈریگن نامی چھپکلی کا وزن 165 کلوگرام اور لمبائی 10 فٹ سے زائد ہوتی ہے۔ اس کی جلد (Skin) پہ اُبھار (Scales)

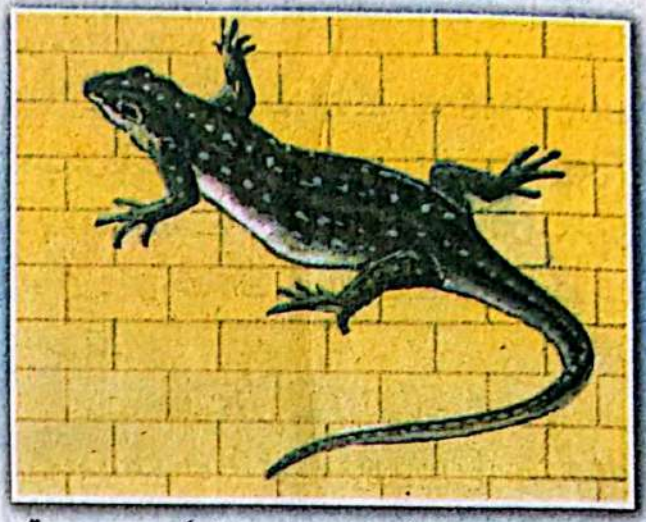

پائے جاتے ہیں۔ جن کی مدد سے یہ خود کو گرنے سے بچاتی ہیں۔ اس کی چار ٹانگیں اور پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔ تاہم کچھ چھپکلیوں میں سانپ کی طرح ٹانگیں نہیں ہوتیں۔ ان کی پچھلی ٹانگیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔

چھپکلی اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لیے برقی قمقموں یا دھوپ کا سہارا لیتی ہے۔ حشرات اس کی مرغوب غذا ہیں۔ یہ سردیوں میں روپوش ہو جاتی ہیں۔

کیرم بورڈ

کھیل کے بڑے بڑے میدانوں میں بھاگ دوڑ اور میچز تو معمول کی بات ہے۔ لیکن کسی کمرے میں بیٹھ کر دو یا چار افراد بیک وقت کھیل میں مصروف ہوں۔ ایسا کھیل کیرم بورڈ ہے۔ کیرم بورڈ کا کھیل ایجاد کرنے والا کون ہے؟ اس کا تو معلوم نہیں۔ تاہم پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، برما اور پُرتگال کے لوگ اسے بڑے شوق سے کھیلتے ہیں۔ اس کھیل کا شمار اندرونی کھیلوں (Indoor games) میں ہوتا ہے۔ 1988ء میں بھارت کے شہر مدراس میں انٹرنیشنل کیرم بورڈ فیڈریشن (ICF) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے قیام کا مقصد کیرم بورڈ کے کھیل کو مقبول کرنا اور اس کھیل سے متعلق قانون سازی کرنا تھا۔ بڑے مقابلوں میں 29sq.inch (اُنتیس سکوائر انچ) پلائی کا بورڈ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے چاروں کونوں پہ کیویٹی (Cavity) یا خانہ ہوتا ہے جس میں اسٹرائیکر (Striker) کی مدد سے 3.18 سینٹی میٹر سے 3.02 سینٹی میٹر کے گول گول Pieces یعنی گیٹیوں کو خانے میں ڈالا جاتا ہے۔

ICF قانون کے مطابق کیرم بورڈ کا اسٹرائیکر 7 سے 9 ملی میٹر ہوتا اور 4.13 سینٹی میٹر سے بڑا اور 15 گرام سے زیادہ وزنی نہیں ہوتا۔ تاہم عام کیرم بورڈ کے اسٹرائیکر کا وزن 5 سے 5.5 گرام بھی ہو سکتا ہے۔ ان گیٹیوں میں سرخ رنگ کی ملکہ (Queen) ہوتی ہے جسے حاصل کرنے والا فاتح کہلاتا ہے۔ پاکستان میں بچے اس کھیل کو بڑے شوق سے کھیلتے ہیں۔ جب کہ اس کھیل کے متعدد سالانہ ٹورنامنٹ بھی کروائے جاتے ہیں۔

---☆☆---

غیبی مدد

کاشف ضیائی (لاہور)

میرا نام طیب حسین ہے اور میں ایک ریٹائرڈ فوجی ہوں۔ ستمبر 1965ء کی جنگ میں میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے میں اگر بھلانا بھی چاہوں تو ساری عمر نہ بھلا سکوں گا۔ ہوا یوں کہ 12 ستمبر 1965ء کو جب جنگ شروع ہوئے چھ دن ہو گئے تو کمپنی ہیڈ کوارٹر ملتان میں میری طلبی ہوئی۔ میرے ذمہ مظفر گڑھ میں واقع دریائے چناب کے پل کی حفاظت کا کام لگایا گیا۔ اگلے ہی دن میں ڈیوٹی پر موجود تھا۔

دراصل جب جنگ شروع ہوتی ہے تو دشمن کی اولین کوشش پل اور ڈیم تباہ کرنے کی ہوتی ہے۔ اس سے فوج کو آگے بڑھنے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں اور نظامِ آب پاشی بھی متاثر ہوتا ہے۔

مظفر گڑھ کے قریب دریائے چناب کا پاٹ خاصا وسیع ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ایک پل تعمیر کیا گیا، جس کی زبردست فوجی اہمیت تھی۔ کمانڈوز کا ایک دستہ میرے ماتحت کام کر رہا تھا یہاں پر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ لوگ بھی تعاون کر رہے تھے۔ میں فارغ وقت میں قرآنی آیات کی تلاوت کرتا رہتا کیوں کہ میرے ایک استاد نے مجھے بتایا تھا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے۔

اگلے کئی دن سکون سے گزر گئے۔ البتہ 15 ستمبر کی رات جب میں ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھا دریا میں رواں دواں پانی کو دیکھ رہا تھا تو دُور سے ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اِس وقت رات کے 10 بجے تھے اور ہر طرف بلیک آؤٹ تھا۔

میرے حساس کانوں نے فوراً یہ بات محسوس کی کہ یہ بھنبھناہٹ انڈین ایئر فورس کے لڑاکا طیاروں کی ہے۔ جو عوام میں خوف وہراس پھیلانے کے لیے ہر طرف بمباری کر جاتے تھے۔ تاہم مجھے یہ اطمینان تھا کہ اِس وقت بلیک آؤٹ ہے اور یہ طیارے بغیر کچھ دیکھے آرام سے گزر جائیں گے۔ پھر بھی میں اٹھ کر دفتر کی عمارت کی طرف چل پڑا۔ میں عمارت سے خاصا دُور بیٹھا تھا اور ابھی میں نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ پل اور اُس سے متعلقہ علاقے کی لائٹیں یک دم روشن ہو گئیں۔

رات کے وقت بلیک آؤٹ کے ہوتے ہوئے دشمن ملک کے طیاروں کی آمد پر اس طرح لائٹوں کا جل جانا بڑی حیرت

کی بات تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کام یقیناً کسی جاسوس نے کیا ہو گا۔ ابھی میں عمارت کے قریب ہی پہنچا تھا کہ میرا سیکنڈ کیپٹن مصطفیٰ دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچا اور پریشانی کے عالم میں کہنے لگا:

"سراب کیا ہو گا؟"

میری نظریں بجائے اس کی بات کا جواب دینے کے آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ دشمن طیارے سر پر پہنچ چکے تھے۔ یہ انڈین ایئر فورس کے 8 لڑاکا طیارے تھے جو اب پل کے اِردگرد منڈلا رہے تھے۔

پھر اچانک اِن طیاروں نے اپنے دھانے کھولے اور تیس چالیس شعلے زمین کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ یہ شعلے درحقیقت تباہ کن بم تھے جو آسمان کی بلندیوں پر شعلوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

"اب یہ بم پل پر گریں گے اور پل آن واحد میں تباہ ہو جائے گا۔ اور دریا کا پانی نشیبی علاقوں کو بہا کر لے جائے گا۔" میں اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکا۔ میں اِن شعلوں کو زمین کی طرف آتا ہوا بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ گھبراہٹ میں میرے منہ سے صرف "اللہ۔" کا لفظ نکلا۔

کہتے ہیں کہ جب انسان اضطراری حالت میں پختہ یقین کے ساتھ اللہ کو پکارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی ضرور مدد کرتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے وہ منظر دیکھا جسے میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو میرا دل اللہ کی عظمت کے خوف سے کانپ جاتا ہے۔

جیسے ہی میرے منہ سے اللہ کا لفظ نکلا مشرق کی طرف سے آسمان پر سفید سفید جھولوں والے کچھ لوگ ظاہر ہوئے۔ انہوں نے سفید رنگ کے لباس پہنے ہوئے تھے اور اپنے سامنے بڑے بڑے جھولے پھیلا رکھے تھے۔ وہ تیزی سے شعلوں کے قریب آئے۔ ایک ایک جھولا بردار نے کئی کئی شعلے اپنے جھولے میں لیے اور آسمان کی تاریکیوں میں گم ہوتا چلا گیا۔ یہ منظر پلک جھپکنے میں مکمل ہو گیا۔ اُسی وقت تیز گھڑگھڑاہٹ ہوئی اور فضا میں پاکستانی طیارے آن موجود ہوئے۔ پاکستانی طیاروں نے دشمن کے 5 طیارے مار گرائے اور باقی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ منظر ختم ہوتے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ملتان کے فوجی ہسپتال میں پایا۔ اپنی حالت درست ہوتے ہی میں مسجد میں گیا اور اللہ تعالیٰ کی اس غیبی مدد پر سجدۂ شکر ادا کیا۔

---☆☆---

انمول باتیں

☆ تعلیم قوموں کے دفاع کا سب سے سستا اور آسان ہتھیار ہے۔
☆ دُوسرے کی رائے کا احترام کرو اور کسی سے یہ مت کہو کہ وہ غلطی پر ہے۔
☆ خوش حالی دوست بناتی ہے اور تنگ دستی اُن کی آزمائش کرتی ہے۔
☆ دُوسروں کی غلطیاں ڈھونڈنے سے بہتر ہے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرو۔
☆ بغیر سوچے سمجھے تقلید کرنا کمزور دماغ کی علامت ہے۔
☆ خوبی اور نیکی دولت سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ دولت نیکی اور خوبی سے وجود میں آتی ہے۔
☆ ہر شخص کو محض اس لیے دوست نہ سمجھو کہ وہ زبان سے کہتا ہے کہ وہ تمہارا دوست ہے۔
☆ ہارتے وہی ہیں جو ہارنے سے ڈرتے ہیں اور جیتتے وہی ہیں جنہیں اپنی جیت کا یقین ہوتا ہے۔
☆ خوشامد سے پرہیز کرو، یہ جہالت سے شروع ہوتی ہے اور ندامت پر ختم ہوتی ہے۔
☆ خوابوں کے آئینے سے نکل کر حقیقت کے آئینوں میں اپنا عکس تلاش کرو۔

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

جادوگر باؤلر
مُرلی دھرن

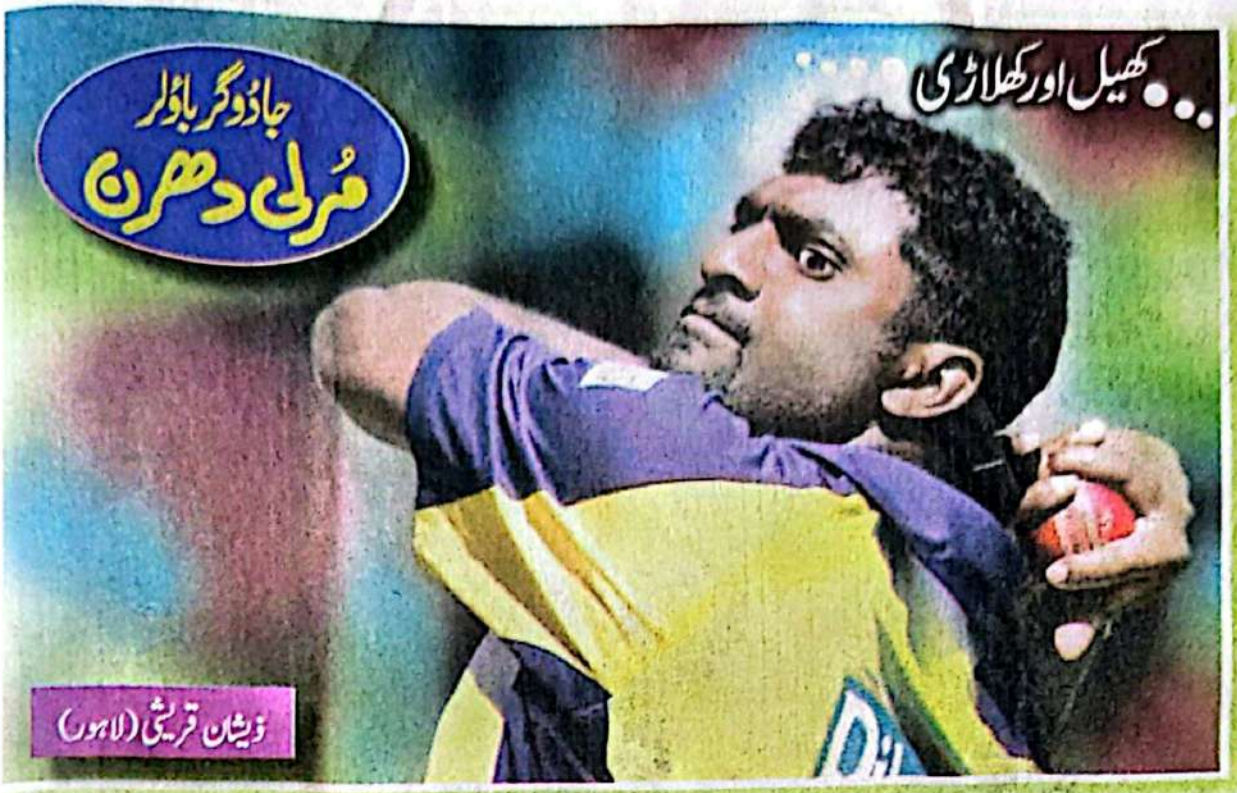

ذیشان قریشی (لاہور)

کسی بھی باؤلر کے لئے سب سے اہم ٹارگٹ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بہترین پرفارمنس سے پوری دُنیا میں اپنا نام روشن کرے۔ ہر کھلاڑی ایک طویل عرصہ تک عمدہ پرفارمنس کا مظاہرہ نہیں کر سکتا، لیکن ایک باؤلر مرلی دھرن ایسا بھی ہے جس نے اپنے ٹیسٹ کرکٹ کے آغاز سے لے کر انجام تک صرف اور صرف محنت سے نام کمانے کی کوشش کی اور اُس نے وہ کارنامہ سر انجام دے دیا جس کا ایک کرکٹر خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ مرلی دھرن نے جب 18 سال قبل اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو اُس نے خود بھی یہ نہ سوچا ہو گا کہ ایک دن پوری دُنیا اُس کے کھیل کی تعریف کرے گی اور اُس کا نام کرکٹ کی دُنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا، بلاشبہ مرلی دھرن کے لئے یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ اُس نے کرکٹ کی دُنیا میں سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کیں اور سب کو یہ باور کروادیا کہ اس جیسا اور کوئی باؤلر نہیں۔ بھارت کے خلاف کھیلے جانے والے اپنے کیریئر کے آخری ٹیسٹ میچ میں مرلی دھرن نے اپنے کیریئر کے آخری ٹیسٹ میچ میں نہ صرف 8 وکٹیں حاصل کیں بلکہ اپنے ٹیسٹ کیریئر کی 800 وکٹیں مکمل کرکے ایک عظیم سنگ میل عبور کر لیا۔ مرلی دھرن کی تباہ کن باؤلنگ کے باعث بھارت کی ٹیم کو ٹیسٹ میچ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مرلی دھرن نے 133 ٹیسٹ میچز میں 800 وکٹیں حاصل کر کے ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے کے اپنے ہی ریکارڈ کو مزید بہتر کیا ہے اور اس ریکارڈ کو توڑنا کسی بھی باؤلر کے لئے آسان ٹارگٹ نہیں ہو گا۔ انہوں نے اب تک ٹیسٹ اور ون ڈے کرکٹ میں مجموعی طور پر 1315 وکٹیں حاصل کر رکھی ہیں جو ایک منفرد اعزاز ہے۔ مرلی دھرن کی تباہ کن باؤلنگ کے باعث سری لنکا کی ٹیم نے کئی مرتبہ تاریخی فتوحات حاصل کیں۔

مرلی کنڈاسالے میں 17 اپریل 1972ء میں پیدا ہوئے، ان کا پورا نام متھایا مرلی دھرن ہے، لیکن مرلی کے نام سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ وہ چار بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ ان کے والد سینا سامے متھایا بسکٹ بنانے والی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ جب مرلی 9 برس کے ہوئے تو انہیں سینٹ انتھونی میں داخل کروادیا گیا۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز میڈیم پیسر کی حیثیت سے کیا، لیکن اپنے کوچ سنیل فرینڈو کے کہنے پر آف سپن بولنگ کے ساتھ مڈل آرڈر بیٹنگ بھی شروع کر دی۔ سکول لائف کے بعد انہوں نے تامل

یونین کرکٹ کلب جوائن کر لیا اور پہلی بار 1991ء میں قومی اے ٹیم کی نمائندگی کرتے ہوئے انگلینڈ کا دورہ کیا۔

مرلی نے 28 اگست 1992ء کو آسٹریلیا کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا۔ ان کا یہ سفر پھر تھما نہیں بلکہ 18 برس تک جاری رہا۔ اس دوران ان کے رستے میں جو بھی آیا، وہ مرلی کے قہر سے بچ نہ سکا۔

5 فروری 2009ء کا دن مرلی کے لئے اس وقت یادگار ثابت ہوا جب انہوں نے بھارتی بلے باز گوتم گھمبیر کو آؤٹ کر کے عظیم فاسٹ بولر وسیم اکرم کا ایک روزہ کرکٹ میں سب سے زیادہ 502 وکٹیں حاصل کرنے کا ریکارڈ توڑا۔ وہ ٹیسٹ کرکٹ میں بھی سب سے زیادہ کھلاڑیوں کا شکار کرنے میں اس وقت کام یاب ہوئے جب انہوں نے 3 دسمبر 2007ء میں شین وارن کا ریکارڈ توڑا۔

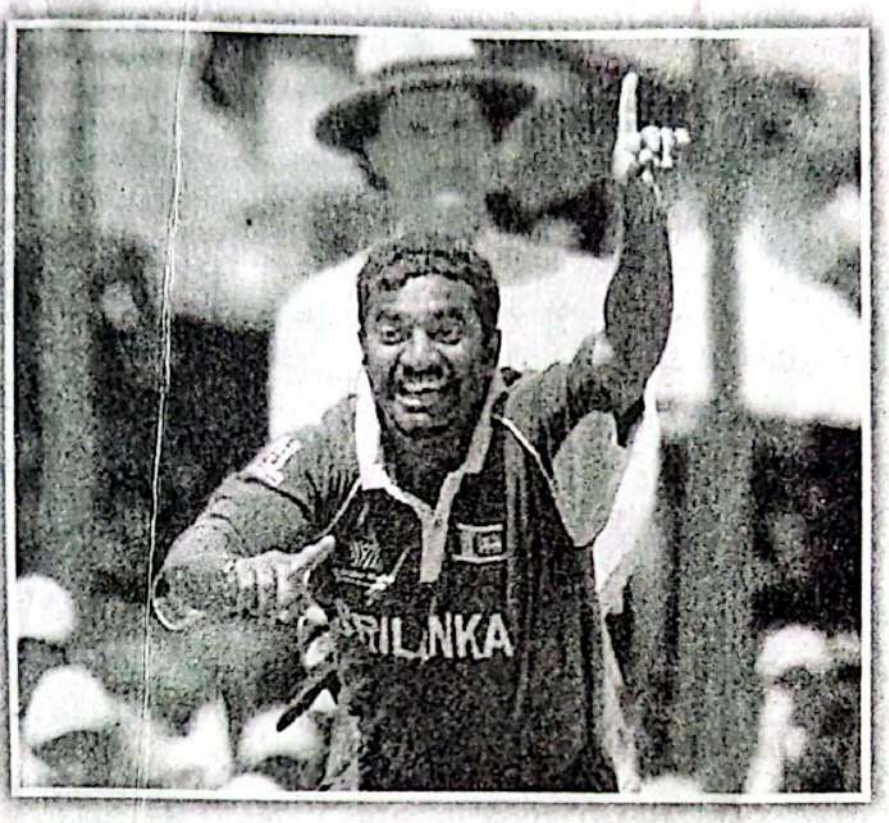

مرلی دھرن کا بولنگ ایکشن کیریئر کے دوران کئی بار مشکوک قرار دیا گیا، لیکن ہر بار وہ بے گناہ ثابت ہوئے۔ مرلی کو آسٹریلیا میں 1995ء میں پہلی بار مشکل کا سامنا کرنا پڑا جب ان کی گیند کو ایمپائر نے اُن کے ایکشن کی وجہ سے نو بال قرار دے دیا۔ اس واقعہ کے بعد چار بار اُن کے ایکشن کے تجزیے کیے گئے اور ہر بار ان کا ایکشن درست قرار دیا گیا۔ آئی سی سی نے مرلی پر ان کی خاص گیند "دوسرا" پھینکنے پر بھی پابندی لگائی، لیکن بعد میں یہ گیند کرنے کی اجازت دے دی۔

مرلی کا کہنا ہے کہ متعدد بار اُن کو لگا جیسے اُن کا کیریئر ختم ہونے والا ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ آسٹریلیا کے پہلے دورے پر تھے اور آسٹریلوی ایمپائر ڈیرل ہیر نے اُن کے بولنگ ایکشن پر اعتراض کیا تھا اور میلبورن میں کھیلے جانے والے دُوسرے کرکٹ ٹیسٹ میں میری گیند کو نوبال قرار دیا تھا۔ مرلی کا کہنا ہے کہ میں ایمپائر کی بات سے بہت پریشان ہوا، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی میری بولنگ ایکشن کو غلط سمجھے گا۔ مرلی دھرن کی کہنی پیدائشی طور پر ٹیڑھی ہے، لیکن ان کی بولنگ کی ویڈیو فلم کے ذریعے تفصیلی جائزے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ یہ غیر قانونی نہیں ہے لیکن تین برس بعد آسٹریلیا کے دورے پر ایڈیلیڈ میں ایک روزہ میچ میں ایمپائر نے یہی اعتراض کیا، اس موقع پر سری لنکا کے کپتان ارجونا رانا ٹنگا اپنی ٹیم کو احتجاجاً گراؤنڈ سے باہر لے گئے۔ سری لنکن کرکٹ بورڈ کے اہلکاروں کی مداخلت کی وجہ سے یہ میچ بحال ہو سکا۔ اس کے بعد بھی مرلی کا آسٹریلیا میں ایک اور تلخ تجربہ ہوا جب پچھلے سال وہاں کے تماشائیوں کی بدسلوکی کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ آسٹریلیا کا دورہ نہیں کریں گے۔ مرلی دھرن کا کہنا ہے کہ میں نے ٹیکنالوجی کے ذریعے ہر چیز درست ثابت کی ہے، میرا ٹیلنٹ خدا کا تحفہ ہے۔

مرلی دھرن ٹیسٹ کرکٹ سے ریٹائر منٹ کے بعد ون ڈے اور ٹونٹی ٹونٹی کرکٹ سے وابستہ رہیں گے۔ ☆☆

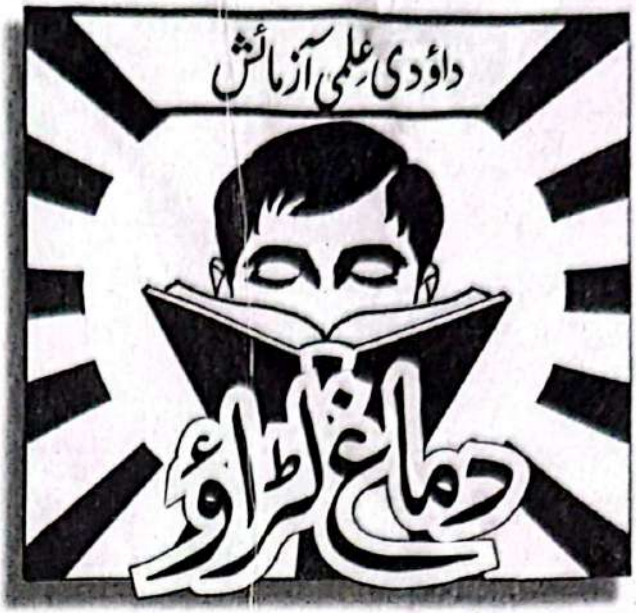

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن مجید میں کس نبی کو "امام الناس" کہا گیا ہے؟

i۔ حضرت آدمؑ ii۔ حضرت نوحؑ iii۔ حضرت ابراھیمؑ

2۔ کون سی مقدس جگہ اب "جبلِ نور" کے نام سے مشہور ہے؟

i۔ غارِ حرا ii۔ غارِ ثور iii۔ کوہِ طور

3۔ ابو البشر کس پیغمبر کو کہا جاتا ہے؟

i۔ حضرت موسیٰؑ ii۔ حضرت ہارونؑ iii۔ حضرت آدمؑ

4۔ صلح نامہ حدیبیہ کس صحابی نے تحریر کیا تھا؟

i۔ حضرت علیؓ ii۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ iii۔ حضرت عثمان غنیؓ

5۔ خون میں کون سے خلیے (سیل) بیماریوں کے جراثیم کا مقابلہ کرتے ہیں؟

i۔ ہیموگلوبن ii۔ سفید خلیے iii۔ سرخ خلیے

6۔ انگریزوں نے بلیک ہول کا واقعہ کس شخصیت سے منسوب کیا تھا؟

i۔ سراج الدولہ ii۔ حیدر علی iii۔ ٹیپو سلطان

7۔ لفظ "اُردُو" کے لغوی معنی "لشکر" کے ہیں۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟

i۔ ہندی ii۔ عربی iii۔ ترکی

8۔ حسن سردار کس کھیل کے معروف کھلاڑی ہیں؟

i۔ کرکٹ ii۔ ہاکی iii۔ فٹ بال

9۔ سید احمد شہید سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے کس مقام پر شہید ہوئے تھے؟

i۔ بالا کوٹ ii۔ مردان iii۔ پشاور

10۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلی عید الفطر کب منائی گئی تھی؟

i۔ 14 اگست 1947ء ii۔ 18 اگست 1947ء iii۔ 17 اگست 1947ء

جوابات علمی آزمائش اگست 2010ء

1۔ نواب زادہ لیاقت علی خان 2۔ چوگوری 3۔ 30 واں نمبر 4۔ میاں عبدالرشید۔ 5۔ فیصل آباد 6۔ سوات۔ 7۔ رہبر اول 8۔ پشاور۔ 9۔ 1967ء 10۔ اصغر سودائی۔

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ سمیرا خالق، کراچی (200روپے کی کتب)

☆ ثمیرا احمد خان، راول پنڈی (175روپے کی کتب)

☆ رُحمار فیع، لاہور (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: یاسر علی لاہور۔ معروف رفیق رحیم یار خان۔ محمد زبیر ارشد ملتان۔ حورالعین ملانہ مظفر گڑھ۔ نعمان فاروق اوکاڑا۔ سیدہ پائندہ حیاساہی وال۔ محمد حنظلہ معاویہ کلور کوٹ۔ فائزہ شکیل وزیر آباد۔ تنزیلہ اسلم، گوجرانوالہ۔ مدثرہ خلیل دینہ۔ ارم نسیم خان کراچی۔ ربیعہ اقبال کراچی۔ بنت محمد طارق عبد الباری کراچی۔ ایمان گیلانی لاہور۔ عاصم شہزاد خان میاں والی۔ عائشہ مجید لاہور۔ اسامہ بن حسن مرید کے۔ اسامہ زاہد فیصل آباد۔ میمونہ اکرم لاہور۔ سید عبدالاسلام اسلام آباد۔ مریم ندیم صدیقی لاہور۔ غلام صابر اوکاڑا۔ محمد طلحہ اعوان راول پنڈی۔ آمنہ یونس لاہور۔ ہارون الرشید جہلم۔ محمد حارث جمیل لاہور۔ مرزا شہیر بیگ ملتان۔ محمد بلال وہاڑی۔ فخر زمان سیال وہاڑی۔ طہ یاسین حیدر آباد۔ عمیر شہزاد شیخ مرید کے۔ محمد ابوذر قاسم میاں والی۔ عاقب سفیان بھکر۔ محمد عمر حسن جھنگ۔ عروسہ عارف راول پنڈی۔ ذوالفقار علی کراچی۔ حیدر زمان مرید کے۔ حمزہ غفور ملتان۔ حمزہ احمد لاہور۔ عمیر بن قمر رحیم یار خان۔ صباء شوکت فیصل آباد۔ محمد سرمد چکوال۔ محمد عتیق الرحمٰن آزاد کشمیر۔ محمد طلال قمر ساہی، اقراء جہلم۔ رافعہ خالد کراچی۔ محمد ذیشان قمر اسلام آباد۔ ثمین رابعہ گوجرانوالہ۔ عبدالوہاب لاہور۔ امل قریشی بہاول ر۔

☆☆

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 2010ء

دماغ لڑاؤ

نام: _____

مقام: _____

پتا: _____

_____

دُھوپ کے بعد

عظمیٰ تسنیم (کراچی)

"آپ ہماری مجبوری سمجھنے کی کوشش تو کریں۔"

فراز نے کاؤنٹر کی طرف جھک کر دوبارہ اُس سے التجا کی۔

"او میرے بھائی کہہ جو دیا آدھے گھنٹے پہلے ہی وقت ختم ہو چکا اب کل صبح آنا۔" اُس نے رجسٹر پر کچھ لکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بتا تو چکا ہوں آپ کو کہ ٹرین لیٹ ہو گئی تھی، ہم دُوسرے شہر سے آئے ہیں۔"

فراز کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی، لیکن سامنے بیٹھے ہوئے اُس دبلے پتلے آدمی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"تو جناب یہ اللہ کا کرم ہے کہ یہاں دُوسرے شہروں سے بھی لوگ آتے ہیں، میرا تو یہ مشورہ ہے کہ ایک دن ہوٹل میں ٹھہر جاؤ اور کل آجانا۔"

اس کے جواب نے فراز کا دماغ گھما دیا، لیکن وہ اجنبی شہر میں بے بس تھا۔ سامنے ہی بینچ پر امی جان بیٹھی تھیں۔ وہ اُسے اشارے سے بلا رہی تھیں۔

"امی جان یہاں کے اصول بڑے سخت ہیں۔ سات بجے صبح سے ہی نمبر لینے پڑتے ہیں پھر ایک گھنٹے بعد نمبر ملنا بند ہو جاتے ہیں۔"

اُس نے دانت پستے ہوئے امی کو بنایا اور پھر ڈاکٹر خان کے بند کمرے کو گھورنے لگا۔

"بیٹا! مریضوں کی اتنی لمبی قطار ہے، قصور ہمارا ہے ہم دیر سے پہنچے ہیں۔ ہماری قسمت میں اس شہر میں ایک دن اور رُکنا لکھا ہے۔"

امی جان نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ہال میں بیٹھے مریضوں پر نظر ڈالی۔ فراز نے دل میں سوچا امی صحیح کہہ رہی ہیں، ایک تو جوڑوں کے مرض نے امی جان کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا اور اُن کی بیماری اور اپنی نوکری کی پریشانی نے فراز کو چڑچڑا سا بنا دیا تھا۔ پچھلے ایک سال سے امی جان کے گھٹنوں کی ہڈی اٹک رہی تھی جس کے باعث وہ کچھ دنوں کے لیے چلنے پھرنے سے قاصر ہو جاتی تھیں۔ مختلف ڈاکٹروں سے علاج چلتا رہا پھر کسی نے انہیں ڈاکٹر خان کا بتایا جو کہ اس قسم کے مرض کے ماہر ڈاکٹر سمجھے جاتے تھے لہٰذا دُوسرے شہر میں ہونے کے باوجود فراز نے پکا ارادہ کر لیا کہ امی کو ضرور انہیں دکھائے گا۔

"امی آپ یہاں بیٹھیں میں معلوم کرتا ہوں کہ ہسپتال کے قریب کون سا ہوٹل ہے۔" یہ کہتے ہوئے فراز دوبارہ ہال کے کونے میں بنے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دبلا پتلا آدمی کسی خاتون سے باتوں میں مصروف تھا۔

"ارے اماں آپ فکر نہ کریں میں یہ ٹفن فوراً اندر پہنچا دوں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ خاتون کاؤنٹر سے ہٹ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگیں۔ اُس پر نظر پڑتے ہی فراز کے منہ سے

بے ساختہ نکلا۔

''ارے یہ تو..... لیکن یہ یہاں کیسے.....'' اُس نے دوبارہ اس خاتون کے چہرے کو بغور دیکھا۔

''اوہ یہ چہرہ تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔''

''معاف کیجئے گا آپ سکینہ بی بی ہیں کیا؟''

اس کے صاف ستھرے اور قیمتی لباس کو دیکھ کر وہ ''ماسی'' کہتے کہتے رک گیا۔

''بیٹا! آپ کون ہیں.....؟'' وہ ابھی پوچھ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے امی جان اُس کے قریب آتے ہوئے بولیں:

''فراز کہاں رہ گئے، ہوٹل کا پوچھ لیا تم نے۔''

''ارے آپ بیگم صاحبہ!'' اب حیرت کی باری ماسی سکینہ کی تھی۔ اُس نے خوشی سے امی جان کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم سکینہ..... یہاں کیسے؟'' امی بھی سٹپٹا سی گئیں۔

''میں تو کافی عرصے سے اس شہر میں رہ رہی ہوں، اور آپ یہاں کیا ڈاکٹر صاحب کے پاس آئی ہیں؟''

امی کے ہاتھ میں ڈاکٹری فائل دیکھ کر ماسی سکینہ نے سوال کیا۔ امی جان کو بیگم صاحبہ کہنے پر فراز کا دل اداس سا گیا کیونکہ امی کا لباس سستے کپڑے کا تھا اور پیروں میں معمولی چپل تھی۔ اُس نے ماسی سکینہ کو دیکھا جو قیمتی کپڑے اور خوب صورت کڑھائی والی چادر پہنے ہوئی تھی، لیکن وہ برابر امی کو ''بیگم صاحبہ'' کا ہی رتبہ دے رہی تھی۔ جب اس کو معلوم ہو گا کہ وہ اب ''بیگم صاحبہ'' نہیں رہیں اور ابو کی وفات کے بعد اُن کا شان دار ماضی اندھیروں میں گم ہو گیا ہے تو شاید ماسی کا یہ جوش ختم ہو جائے۔

ماسی سکینہ کو فراز نے ہوش سنبھلاتے ہی اپنے گھر میں ایک آیا، ماسی اور بوا کی حیثیت سے دیکھا تھا، گھر کا ہر کام اس کے ذمہ تھا مگر وقت کے چکر نے سب کچھ چکرا دیا تھا۔

فراز اپنی سوچوں سے نکل آیا۔ اُس نے دیکھا اب ماسی سکینہ امی کو اپنے گھر لے جانے کے لیے بضد تھی۔

''ارے آپ چلیے تو میرے ساتھ، میں تو صرف ڈاکٹر خان کو یہاں کھانا پہنچانے آئی ہوں۔''

''اچھا تو کیا تم ان کے ہاں کام کرتی ہو؟'' امی بھی اس کے ساتھ برآمدے میں چلتے چلتے بولیں اور مجبوراً فراز بھی بیگ کاندھے پر ڈالے پیچھے چل دیا۔

''ہاں جی ان کے گھر کے سارے کام میرے ذمہ ہیں، بس آپ فکر نہ کریں، ڈاکٹر خان آپ کا چیک اپ گھر پر ہی کر لیں گے، شریف انسان ہیں۔''

سکینہ بی بی کی بات سن کر فراز کی کوفت ختم ہو گئی اور اُسے ایسا لگا جیسے اُن کا آنا بے کار نہیں گیا پھر وہ ڈاکٹر خان کے ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے اُن کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک خوب صورت بنگلے میں موجود تھے، میز پر چائے کے ساتھ بہت سے لوازمات تھے، لیکن دونوں ہی جھجک محسوس کر رہے تھے۔ شاید انہوں نے خواب میں بھی سوچا نہ تھا کہ ایک دن وہ اس ماسی کے گھر پناہ لیں گے جسے اپنے گھر سے خود ان لوگوں نے نکالا تھا۔

''سکینہ! تم نے اپنے بیٹے ابراہیم کے بارے میں نہیں بتایا۔''

امی جان یہ پوچھتے ہوئے شرمندہ سی ہو گئی تھیں۔

''بیگم صاحبہ! اس شہر میں اس لیے نظر آ رہی ہوں کہ ابراہیم کی نوکری یہاں لگ گئی تھی، وہ شام آئے گا اور آپ لوگوں سے مل کر یقیناً بہت خوش ہو گا۔'' ماسی سکینہ کے چہرے پر خوشی تھی۔

''سکینہ! مجھے اچھا نہیں لگ رہا تم مجھے بیگم صاحبہ نہ کہو کیونکہ تمہارے صاحب کے انتقال کے بعد قرضوں میں جکڑا کاروبار ختم ہو گیا، گھر فروخت ہو گیا بیٹے کو اعلیٰ تعلیم نہ دلا سکی، ہم تو اب بہت ہی معمولی لوگ ہیں اور ہمیں.....'' امی جان رو پڑیں۔

سکینہ بی بی جھٹ امی کو گلے لگا کر دلاسہ دینے لگی۔

''جان ہے تو جہان ہے..... اللہ آپ کے فراز کو سلامت رکھے اور آپ کو صحت دے، روپے پیسہ آنی جانی چیز ہے۔ اور عزت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور یقین کریں آپ میرے لیے پہلے جیسی ہی محترم ہیں۔''

ماسی سکینہ کی باتوں سے امی کی ڈھارس بندھ گئی۔

---☆☆---

تھکن کے باعث فراز کو بستر پر لیٹتے ہی نیند آگئی۔

آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا امی اُس کا کاندھا ہلا رہی ہیں۔

"پلیز! امی چھٹی کا دن ہے آج تو دیر تک سونے دیں۔"

اُس نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا تو امی جان نے اُس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"بیٹے! یہ آپ اپنے گھر میں نہیں سو رہے، یہ لاہور ہے..... اب شام ہو رہی ہے۔"

فراز بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"سکینہ ہمیں دوبارہ بلانے آچکی ہے، میں نے کہا کہ فراز اٹھ جائے تو ساتھ آجاؤں گی، ابراہیم آچکا ہے، جلدی چلو۔"

جیسے ہی وہ کمرے سے نکلے سامنے ہی لاؤنج میں رکھی کرسیوں پر ماسی سکینہ اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ یقیناً یہ ابراہیم ہی تھا جو کہ فراز کا ہم عمر تھا۔ امی جان کو احترام سے سلام کر کے وہ فراز کی طرف بڑھا۔ فراز اُس لڑکے سے نہ چاہتے ہوئے بھی بغل گیر ہو گیا کیونکہ فراز جانتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے بغیر ڈاکٹر جان سے نہیں مل سکتا تھا لہٰذا تمام پرانی باتیں اُس نے ذہن سے نکال دی تھیں۔

"بیٹا! آپ تو گھوڑے بیچ کر سوئے، دوپہر کا کھانا بھی گول کر دیا۔" ماسی سکینہ نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"اماں آپ نے چائے پر اتنا اہتمام کر دیا تھا کہ بھوک ہی نہیں لگی، اب بھی میں صرف چائے ہی پیوں گا۔"

فراز کے اماں کہنے پر سکینہ بی بی کا چہرہ کھل اٹھا اور فراز کی امی جان کی آنکھوں میں اطمینان کی چمک تھی۔

"مجھے اماں نے صبح ہی فون پر بتایا تھا کہ آپ لوگ آئے ہیں، لیکن کام کی زیادتی کی وجہ سے میں چھٹی نہ کر سکا۔"

ابراہیم کے لہجے میں بڑی شائستگی تھی۔ فراز نے چونک کر اُس کی چمک دار آنکھوں کو دیکھا اور سوچا یقیناً ابراہیم کو سکینہ بی بی نے میٹرک تو کروا لیا ہو گا کیونکہ اس کی اولین خواہش یہی تھی کہ ابراہیم پڑھ لکھ جائے۔

"بھائی فراز! آپ کمرے سے بیگم صاحبہ کی فائل لے آئیں۔"

ابراہیم نے جواب دینے کے بجائے ماسی سکینہ کی طرف دیکھا۔ سکینہ کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ابراہیم کے قریب کھڑی ہو گئی اور ابراہیم کے کان محبت سے کھینچتے ہوئے بولی:

"یہی تو ڈاکٹر ابراہیم خان ہے، جس کے سخت اصولوں نے آپ لوگوں کو صبح ہسپتال میں پریشان کر دیا تھا۔"

"ڈاکٹر خان..... یہ"

"ابراہیم اور ڈاکٹر خان۔"

امی جان اور فراز ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"معاف کرنا..... میں پہلے آپ لوگوں کو نہ بتا سکی، دراصل آپ دونوں کے شرمسار چہرے مجھے بہت کچھ بولنے سے روک گئے اور میں آپ لوگوں کو مزید دکھی اور شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

سکینہ بی بی کے لہجے میں خلوص تھا۔

"میں، میں شرمندہ ہوں سکینہ ہم نے تمہیں دکھ دیا تو ہم بھی سکھ سے نہ رہ سکے۔" امی کا یہ کہنا تھا کہ ماسی تڑپ اٹھی۔

"ایسا نہ کہیں۔ یہ تو قسمت میں لکھا تھا آپ کے پاس سے نکل کر مجھے ایک ڈاکٹر کے گھر نوکری مل گئی۔ انہوں نے میری التجا پر ابراہیم کو پڑھایا لکھایا پھر ڈاکٹر شیرازی کراچی شہر چھوڑ کر اپنے باپ دادا کی زمینوں پر لاہور آگئے اور یہاں ہسپتال بنوایا۔ اور آج ڈاکٹر شیرازی کے ہسپتال میں ابراہیم کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر شیرازی نے ہی یہ گھر، گاڑی اور ڈرائیور دیا ہے۔ بس اب تو ماشاء اللہ اگلے مہینے اس کی شادی ہے، آپ لوگوں کا احسان میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ آپ نے مجھ بیوہ کو اپنے گھر دس سال رکھا تھا۔"

امی جان کے چہرے پر اطمینان تھا اور فراز نے ٹھنڈی سانس بھر کر ماسی کی اعلیٰ ظرفی کی داد دی۔ ماسی سکینہ امی جان کو پتا نہیں کیا کچھ بتا رہی تھی، لیکن فراز کا دماغ ماضی میں کھو گیا

جب ماسی سکینہ نے یہ کہا تھا کہ میں ابراہیم کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں تو ابو نے اُس کا خوب مذاق اڑایا اور امی جان بھی طنز پر اتر آئیں اور خود فراز جو کہ چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، خوب ہنسا کہ "ماسی! تُو اپنے بیٹے کو کیسے ڈاکٹر بناؤ گی۔"

"سکینہ! سنو پانچویں تک ابراہیم نے پڑھ لیا ہے، اب اِسے گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں لگا دو، سودا سلف لانے کی آسانی بھی ہو جائے گی اور.....

ابو جان کی بات کاٹتے ہوئے ماسی نے دو ٹوک الفاظ میں یہی کہا تھا:

"صاحب جی! میرے اللہ نے چاہا تو ابراہیم ڈاکٹر ضرور بنے گا، آپ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے کسی اور کو رکھ لیں۔"

"دیکھو تمہارا بیٹا تو آوارہ گردی بھی کرتا ہے، زیادہ ذہین بھی نہیں پھر تم کیوں ایسے خواب دیکھ رہی ہو، اب ہمارے فراز کو دیکھو دن رات ایک کر کے پڑھتا ہے، ڈاکٹر تو ایسے بچے بنتے ہیں۔"

امی نے کہا: "بیگم صاحبہ میں اس لئے تو فراز میاں کے اسکول کا داخلہ فارم مانگ رہی تھی، ابراہیم بھی اچھے سکول اور اچھی صحبت میں پڑھ لے گا۔"

ماسی سکینہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ آخر تنگ آ کر ابو جی نے اس کی ہمیشہ کے لیے چھٹی کر دی۔

آج وہی ماسی سکینہ اپنے بیٹے کو فخر سے دیکھ رہی تھی جو کہ امی جان کی فائل پر جھکا اُن کی رپورٹس پڑھ رہا تھا۔

"فراز بھائی! ان شاء اللہ ہم آج سے ہی علاج شروع کرتے ہیں، امی جان نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، ڈاکٹر شیرازی کو اپنے اسپتال کے لئے ایک ذہین، محنتی اکاؤنٹ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شیرازی انتہائی مشفق انسان ہیں اگر آپ اسے اپنا اسپتال سمجھ کر کام کریں گے تو یقیناً اس میں آپ کے لیے فائدہ ہی فائدہ ہے۔"

یہ سن کر فراز دنگ رہ گیا۔ وہ پُر جوش انداز میں آگے بڑھا اور ابراہیم کے ہاتھ چوم لیے۔

"ابراہیم مجھے آج اندازہ ہوا ہے کہ دُنیا میں اعلیٰ ظرف لوگ ابھی باقی ہیں اور اللہ ہی وہ پاک ذات ہے جو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔"

فراز کی اس بات نے سب کے چہروں پر یقین بکھیر دیا اور خود فراز کو محسوس ہوا جیسے وہ دُھوپ کے بعد گھنی چھاؤں میں آ گیا ہو۔

---☆☆---

راستہ تلاش کریں

عروج اپنے گھر کا راستہ بھول گئی ہے۔ راستہ تلاش کرنے میں اس کی مدد کریں تاکہ وہ اپنے گھر پہنچ سکے۔

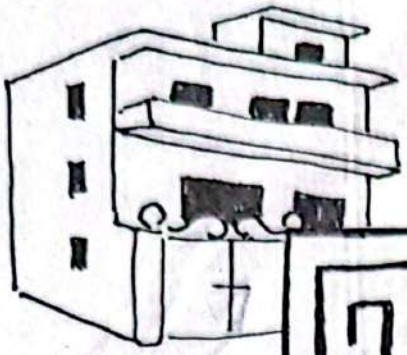

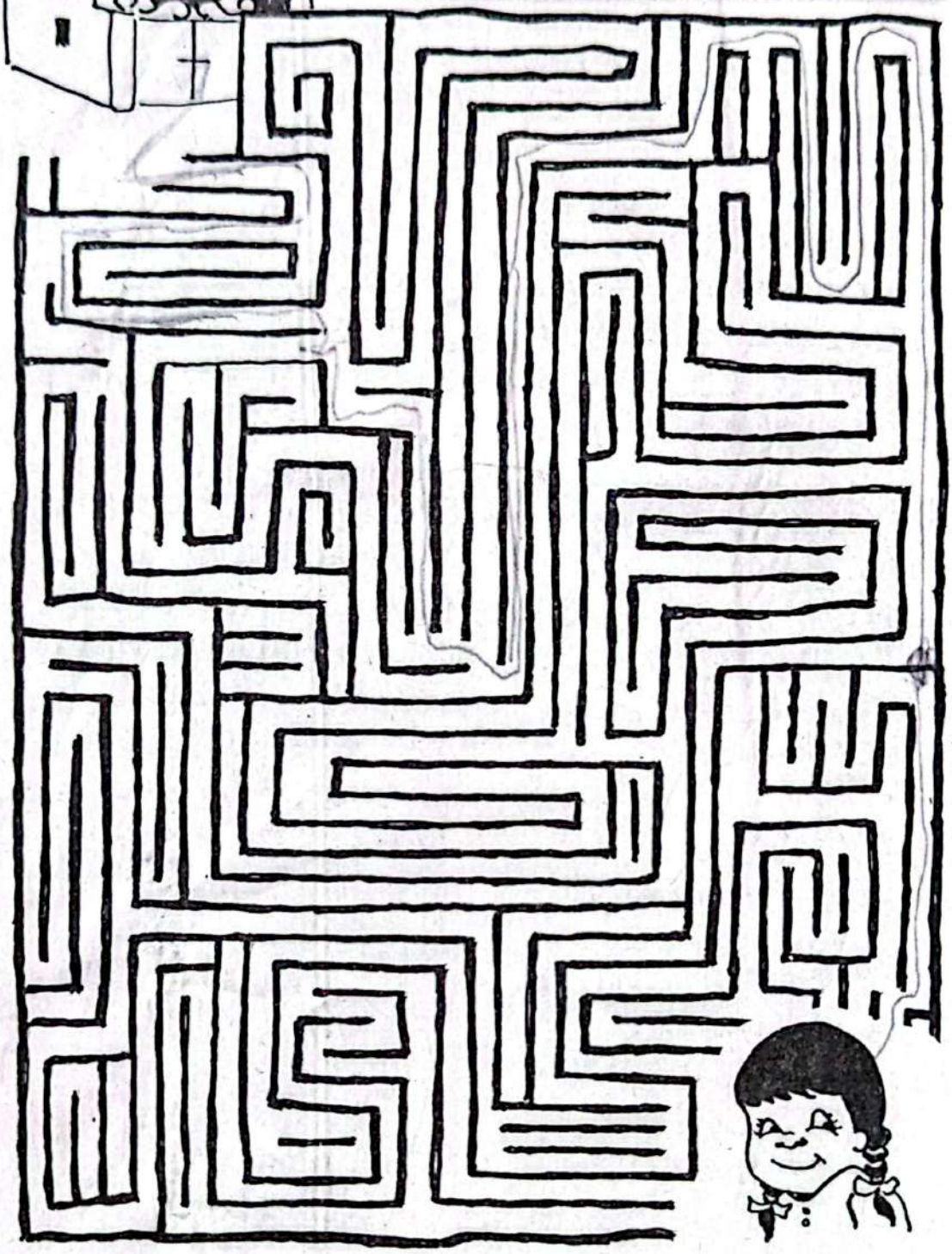

(حافظ محمد معاذ ابو طالب، کراچی)

ڈاکٹر بلال احمد ابھی ہسپتال سے گھر پہنچے ہی تھے کہ ان کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے موبائل آن کیا تو دُوسری طرف سے ایک گھبرائی ہوئی آواز آئی:

"سر! میں آپ کا خادم اختر بات کر رہا ہوں..... سر پلیز آپ دوبارہ ہسپتال آجائیں، میری والدہ کو دل کا دورہ پڑا ہے، پلیز ڈاکٹر صاحب پلیز آپ فوراً آجائیں۔" اختر کی بات سن کر انہوں فوراً ہامی بھرتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔"

ڈاکٹر بلال احمد نے فون آف کیا اور گیراج میں گاڑی کی طرف آئے اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے، مگر کافی کوشش کے باوجود انہیں ناکامی ہوئی شاید گاڑی کا انجن گرم ہو چکا تھا۔ پھر وہ پیدل ہی اپنا بریف کیس اٹھائے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔ وہ ابھی تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ اندھیرے میں ایک

سایہ اُن کے پیچھے کی طرف آیا اور ڈاکٹر بلال احمد کو اپنی گردن میں کوئی نوکیلی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ رک گئے۔ وہ سایہ دراصل ڈاکو تھا۔ ڈاکو نے غرا کر کہا: "سیدھے کھڑے ہو جاؤ! اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو یہ چاقو گردن کاٹنے میں دیر نہیں لگائے گا۔"

ڈاکٹر بلال احمد نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس ڈاکو سے کہا: "میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" ڈاکو نے غرا کر کہا:

"تمہارے پاس جو کچھ ہے میرے حوالے کر دو! ورنہ یہیں تمہارا کام تمام کر دوں گا۔" ڈاکٹر بلال احمد نے سارے پیسے نکال کر اس کو دے دیئے۔ اتفاق سے اُسی وقت ایک گھر کا بلب روشن ہوا تو ڈاکٹر بلال احمد نے دیکھا کہ وہ کوئی بائیس تئیس سال کا نوجوان تھا۔ ڈاکٹر بلال احمد نے کہا: "اب تو مجھے جانے دو، میں ایک ڈاکٹر ہوں، اس وقت ایک مریضہ کی زندگی خطرے میں ہے اور مجھے ہسپتال جلدی پہنچنا ہے۔"

ڈاکو نے اُن کی گردن میں چاقو کی نوک چبھاتے ہوئے کہا: "تم پانچ منٹ تک یہیں کھڑے رہو اگر تم نے شور مچایا تو انجام بہت بھیانک ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ طرف چل دیا۔

ڈاکٹر بلال جب ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر راشد نے انہیں دیکھ کر کہا: "سر! آپ نے بہت دیر کر دی۔" مریضہ کی حالت بہت بگڑ چکی تھی فوری آپریشن نہ ہونے کی وجہ سے آخر کار وہ دم توڑ گئیں۔"

یہ سن کر ڈاکٹر بلال احمد کو بہت دُکھ ہوا، انہوں نے اختر کو دلاسہ دیا اور اپنے ساتھ پیش آنے والا سارا واقعہ بتا دیا۔

کچھ عرصے بعد ایمرجنسی وارڈ میں ایک نوجوان کو لایا گیا۔ ایک حادثے میں اُس کا ایک ہاتھ کٹ چکا تھا اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر بلال احمد اس نوجوان کو دیکھ کر اک دم چونکے۔ یہ وہی ڈاکو تھا جس نے انہیں ہسپتال آتے ہوئے لوٹا تھا۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں کو اس زخمی نوجوان کو آپریشن تھیٹر میں لے جانے کے لیے کہا۔ پھر ڈاکٹر بلال احمد نے آپریشن کر کے نوجوان کا کٹا بازو جوڑ دیا۔ آپریشن کے بعد نوجوان کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ اگلے دن ڈاکٹر بلال احمد نے وارڈ کا دورہ کرتے ہوئے نوجوان سے پوچھا:

"نوجوان اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ نوجوان الجھے ہوئے لہجے میں بولا: "میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔" ڈاکٹر بلال احمد نے فوراً کہا: "یاد کرو آج سے تین ماہ پہلے تم نے مجھے ایک اندھیری گلی میں لوٹا تھا اور میں نے تم سے کہا تھا کہ بھائی تم مجھے چھوڑ دو میں ایک ڈاکٹر ہوں اور مجھے ہسپتال جلدی پہنچنا ہے کیوں کہ ایک مریضہ کی حالت خراب ہے، مگر تم نے مجھے جانے نہیں دیا تھا، وہ مریضہ مر گئی تھی۔" ڈاکٹر بلال احمد نے اسے سارا واقعہ یاد دلایا۔ وہ بہت پریشان ہوا اس نے فوراً ڈاکٹر بلال احمد سے معافی مانگی اور کہا: "ڈاکٹر صاحب! مجھے معاف کر دیں میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا اور میں آپ کی رقم آپ کو واپس لوٹا دوں گا۔" ڈاکٹر بلال احمد نے کہا: "مجھے اپنے لوٹنے کا کوئی غم نہیں۔ مجھے یہ افسوس ہے کہ میرے دیر سے پہنچنے پر وہ مریضہ چل بسی اور اس کے کچھ عرصے بعد اس مریضہ کا اکلوتا بیٹا اپنی ماں کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکا اور وہ بھی چل بسا۔ اب تم صرف اللہ سے معافی مانگو۔ بے شک کسی نے سچ کہا کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ وہ پکڑنے پر آتا ہے تو اُس کی پکڑ بہت سخت ہوتی ہے۔"

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

صبحِ نو

(طوبیٰ ریاض، ساہی وال)

"اُٹھ میری چندا چل میرے ساتھ کام پر۔" رحیم بی بی نے دُکھی دِل کے ساتھ سوئی ہوئی اپنی دس سالہ بیٹی کو آواز دی۔

"میں کام پر نہیں جاؤں گی۔"

آنکھیں ملتے ہوئے معصوم سی پلوشہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، مگر اُس نے آنکھیں کھول کر جب ماں کی بھیگی آنکھوں کو دیکھا تو بولی: "چل ماں کام پر چلیں، دیر ہو رہی ہے۔" پلوشہ نے پاؤں میں چپل پہنتے اوڑھنی کی بکل مارتے ہوئے کہا۔

دونوں آگے پیچھے ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستے پر گامزن ہو گئیں۔ آج رحیم بی بی کے قدموں میں پہلی جیسی چستی اور پھرتی نہ تھی۔ اُس کی نظریں بار بار میلے کپڑوں میں ملبوس اپنی بیٹی کی سمت اُٹھ رہی تھیں۔ اُس نے اپنی بیٹی کے لئے بڑے خوب صورت خواب دیکھے تھے۔ اس نے ہمیشہ سوچا تھا کہ اُس کی بیٹی پڑھ لکھ کر استانی بنے گی۔

بیٹی کو پڑھانے کے لئے مشکل سے اُس نے اپنے اَن پڑھ شوہر اور پہلی جماعت سے بھاگنے والے بیٹے سے اجازت لی تھی۔

ایک دِن سکول جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد پلوشہ روتی ہوئی گھر واپس آگئی۔ "ماں، ماں دہشت گردوں نے ہمارا سکول جلا دیا ہے، اب میں کہاں پڑھوں گی؟" بچی روتے ہوئے فریاد کر رہی تھی۔ ماں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ کیا ہو گیا؟ کیا میری بچی بھی ساری عمر میری طرح گھروں میں کام کر کے زندگی گزارے گی۔ اِس اندھیرے میں یک دم اُمید کی کرن چمکی۔

"میری چندا! تُو پریشان نہ ہو۔ چل میرے ساتھ، بی بی جی کی بڑی بیٹی بڑے سکول میں پڑھتی ہے۔ وہ سکول بھی آج کل بند ہے وہ گھر پر ہوتی ہے میں اُس کی منت کروں گی۔ وہ تمہیں پڑھا دیا کرے گی۔" پلوشہ کی روتی ہوئی آنکھوں میں آس کے جگنو پھر چمکنے لگے۔ کیڑے کا تھیلا کندھے پر لٹکائے وہ خوشی خوشی کوٹھی کی طرف چلنے لگی۔

"چھوٹی بی بی! یہ میری بیٹی پلوشہ ہے۔ اِسے پڑھنے کا بڑا شوق ہے مگر ظالموں نے اِس کا سکول جلا دیا ہے۔ تم اِسے پڑھا دیا کرنا۔ یہ تمہاری خدمت بھی کرے گی۔" رحیم بی بی بڑی منت سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ چھوٹی اِدھر آؤ، اپنا بستہ گلے سے اُتار دو۔ پہلے اچھی طرح سے میرے کمرے کی صفائی کرو پھر پڑھائی کرنا۔" چھوٹی بی بی نے حکم جاری کیا۔

پڑھنے کے شوق میں پلوشہ نے چھوٹی بی بی کا ہر حکم مانا۔ پھر کبھی چھوٹی بی بی اور کبھی بڑی بی بی کی پکار میں پڑھائی کہیں گم ہو کر رہ گئی۔

ایک دن چھوٹی بی بی کے کمرے میں صفائی کرتے ہوئے پلوشہ کی نظر ٹی وی پر نشر ہوتی خبروں پر پڑی۔ حکومت نے اعلان کیا کہ جن علاقوں میں بچیوں کے سکول جلا دیئے گئے تھے وہاں فی الحال خیموں میں کلاسز شروع کی جا رہی ہیں۔

"اماں، اماں، جلدی گھر چلو، میں نے سکول جانا ہے۔ مجھے سکول جانے کی تیاری کرنی ہے۔" پلوشہ نے جھاڑو پھینکتے ہوئے خوشی سے چلا کر کہا۔ مایوسی کے اندھیرے چھٹ چکے تھے اور صبحِ نو طلوع ہو چکی تھی۔

(دُوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

حقیقی روزہ

(عائشہ مظفر، لاہور)

"امی، کیا میں عالیہ کے گھر چلی جاؤں؟ اُس نے مجھے افطاری کی دعوت دی ہے۔" میں نے امی سے پوچھا۔

"بیٹی! ضرور جاؤ۔" امی بولیں۔

"شکریہ امی!" یہ کہہ کر میں گھر سے باہر نکل کر گلی میں آئی۔ گلی میں آخری گھر عالیہ کا تھا۔ عالیہ کی امی نے دروازہ کھولا اور مجھے عالیہ کے کمرے کی طرف لے گئیں۔

عالیہ! دیکھو فاطمہ آئی ہے۔"

"ارے فاطمہ تم آگئی۔" عالیہ نے خوش دلی سے کہا۔

"ماما! آپ باہر جائیں۔ ہمیں ڈسٹرب کرنے کوئی مت آئے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنی امی کا جواب سنے بغیر دروازہ بند کر دیا اور آکر میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"فاطمہ! کیسی ہو تم؟" اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

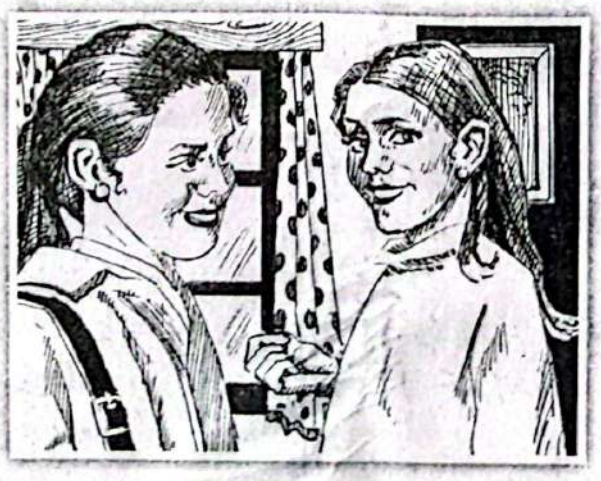

"میں ٹھیک ہوں، عالیہ تمہیں اپنی امی کے ساتھ اس طرح سے پیش نہیں آنا چاہئے تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں ان سے ناراض ہوں۔ میں نے صبح ان سے عید کی شاپنگ کے لئے ایک ہزار روپیہ مانگا تھا، مگر انہوں نے صرف پانچ سو روپے دیئے تھے۔" عالیہ نے غصے سے جواب دیا۔

مجھے عالیہ کا یہ رویہ پسند نہیں آیا۔

کچھ دیر بعد عالیہ کے چھوٹے بہن بھائی "عالیہ آپی! عالیہ آپی!" پکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ "تم میرے کمرے میں مت آؤ، فوراً نکلو یہاں سے۔" یہ کہہ کر عالیہ نے دونوں کے منہ پر ایک ایک تھپڑ رسید کیا۔ وہ دونوں روتے ہوئے واپس چلے گئے۔ مجھے عالیہ کا ایسا کرنا اچھا نہیں لگا۔

کچھ دیر بعد جب بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی تو ہم اٹھ کر باہر آئیں تو ایک ننھے بچے کو اپنے سامنے پایا۔ اُس کے کپڑے میلے اور پھٹے پرانے تھے۔

"باجی! گھر میں افطاری کے لئے کچھ موجود نہیں، کیا تھوڑا سا کھانا مل سکتا ہے؟" اُس نے سوالیہ نظروں سے ہماری جانب دیکھا۔

"نہیں! تمہیں یہاں سے سوکھی روٹی بھی نہیں ملے گی۔ پورے محلے میں تمہیں صرف ہمارا ہی گھر نظر آتا ہے کیا؟ ہر وقت منہ اٹھا کر چلے آتے ہو۔ اب جاؤ یہاں سے ورنہ.....!" عالیہ نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ بچہ خوف زدہ ہو کہ وہاں سے چلا گیا۔

میں عالیہ کا یہ روپ دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ افطاری کے بعد ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اور کمرے میں گئیں۔ میں نے عالیہ سے کہا: روزہ رکھنے کا مقصد صرف یہ نہیں کہ ہم کھانے پینے سے پرہیز کریں بلکہ اِس میں ہم ہر اُس کام سے پرہیز کرتے ہیں جو اللہ کے ہاں ناپسند کیا جاتا ہے۔ روزہ ہمیں غریبوں کی بے بسی، تنگی اور بھوک کا احساس دلاتا ہے، اگر ہمارے دل میں یہ احساس ہی پیدا نہ ہو تو روزہ رکھنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔" میری بات سن کر عالیہ بولی: "فاطمہ! میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ روزے کے دوران بھی میرا برتاؤ دُوسروں کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ میں ان باتوں کا خیال رکھوں گی۔"

---☆☆---

"عید" کا لفظ "عود" سے نکلا ہے جس کے معنی لوٹنے اور بار بار آنے کے ہیں۔ چونکہ یہ تہوار ہر سال لوٹ کر آتا ہے، اسی لیے اسے "عید" کہتے ہیں۔

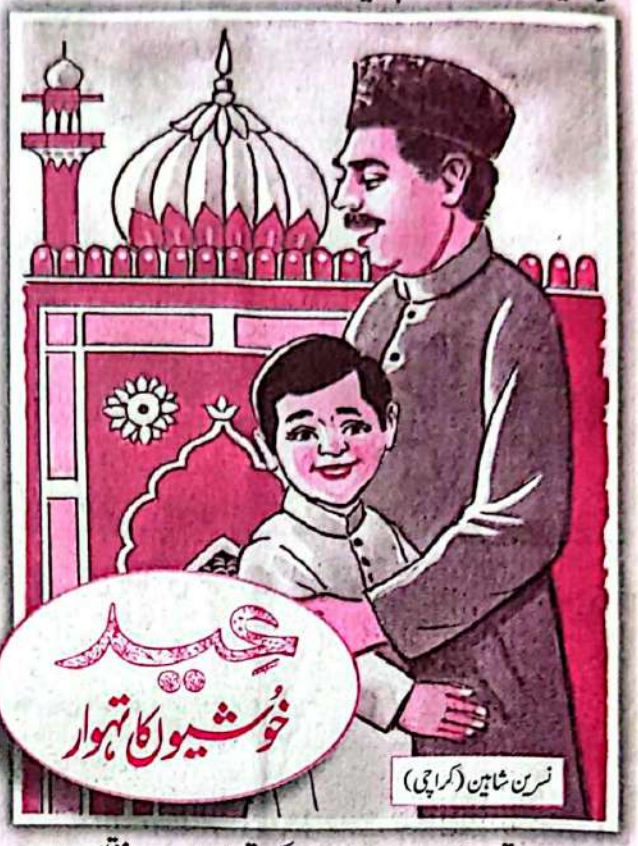

اسلامی تہوار دُوسرے مذاہب کے تہواروں سے مختلف ہیں، اور یہ بھی اسلام کا اعجاز و انداز ہے کہ پورے سال میں صرف دو دو عیدیں مقرر کی گئی ہیں۔ جب کہ دُنیا کے دُوسرے مذاہب میں سال کے دوران کئی تہوار منائے جاتے ہیں۔

یکم شوال کو "عیدالفطر" اور دس ذی الحجہ کو "عید الاضحیٰ" منائی جاتی ہے۔ جن ایام کو اسلام نے تہوار کے لیے مقرر فرمایا، ان کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ وابستہ نہیں جو ماضی میں ایک مرتبہ پیش آ کر ختم ہو چکا ہو بلکہ اس کے بجائے ایسے خوشی کے واقعات کو تہوار کی بنیاد قرار دیا جو ہر سال پیش آتے ہیں اور ان کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں عیدیں ایسے موقع پر مقرر فرمائی ہیں جب مسلمان کسی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہیں، یعنی عیدالفطر رمضان المبارک کے روزے گزرنے کے بعد رکھی ہے کہ اللہ کے بندوں نے پورے مہینے صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کھانا پینا چھوڑے رکھا اور نفسانی خواہشات سے بچے رہے اسی خوشی اور انعام میں عیدالفطر مقرر فرمائی۔ اسی طرح عیدالاضحیٰ ہر سال حج کی ادائیگی کے بعد 10 ذی الحجہ کو منائی جاتی ہے۔

حدیث میں عید الفطر کے دن کو "یوم الجائزہ" بھی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورے مہینے کی عبادتوں پر انعام دیئے جانے کا دن، جو مغفرت کی شکل میں دیا جاتا ہے۔

اسلام میں عید کا آغاز ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں عیدین کا مبارک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جس کا تذکرہ حدیث میں ملتا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اہلِ مدینہ سال میں دو دن بطور تہوار منایا کرتے تھے جن میں وہ کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: یہ دو دن جو تم مناتے ہو، ان کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟ یعنی ان تہواروں کی اصلیت اور تاریخی پس منظر کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم عہدِ جاہلیت میں (یعنی اسلام سے پہلے) یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے۔ یہ سن کر حضور مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ان دونوں تہواروں کے بدلے میں تمہارے لیے ان سے بہتر دو دن مقرر فرما دیئے ہیں۔ یومِ عیدالفطر اور یومِ عیدالاضحیٰ۔" (سنن ابی داؤد)۔

عید کے دن حجامت بنوانا، ناخن تراشنا، غسل کرنا، مسواک کرنا، خوشبو لگانا، اچھے اور صاف ستھرے کپڑے پہننا، صبح نمازِ فجر اپنی مسجد میں پڑھ کر عیدگاہ چلے جانا اور عید گاہ جاتے وقت راستہ تبدیل کرنا سنت ہے۔ سنت طریقہ یہ ہے کہ جس راستے سے عید گاہ جائیں، نماز پڑھ کر اُس راستے کے بجائے دُوسرے راستے سے گھر واپس جائیں۔ عید گاہ جانے سے قبل کسی میٹھی چیز کا کھانا بھی سنت ہے۔ حضورؐ طاق اعداد میں کھجوریں تناول فرماتے تھے۔ نمازِ عید سے قبل فطرہ ادا کرنا۔ عید کے دن کے مستحب امور ہیں۔

---☆☆---

"صحرا میں رہنے والا ایک بدو بادشاہ کے لیے میٹھے پانی کا ایک گھڑا لے کر روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ بادشاہ کے محل کے باہر دریا کی اُونچی اُونچی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ وہ بہت افسردہ ہوا کہ اس دریا کی موجودگی میں ایک گھڑے کے پانی کی حیثیت کیا؟ یہ سوچ کر اُس نے گھڑے کا پانی دریا میں انڈیل دیا۔

بادشاہ نے جب اُسے یہ کرتے دیکھا تو اسے بڑی حیرت سے کہ لوگ تو دریار سے پانی لیتے ہیں۔ اور یہ اس میں پانی ڈال رہا ہے۔ جب اس نے بدو سے وجہ پوچھی تو بدو نے سارا ماجرا کہہ دیا۔ بادشاہ نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ بدو کو اس کے وزن کے برار سونا دیا جائے۔ کیونکہ خلوص تحفے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے جو تحفہ دینے والے کے دل میں ہوتا ہے۔"

"پانی بھی کوئی تحفہ ہوتا ہے؟" منیرہ نے حیرت سے پوچھا سارے بچے دادی جان کے گرد بیٹھے کہانی سن رہے تھے۔

"اگر سخت پیاس لگی ہو تو کیا چاہیے ہوتا ہے؟" دادی جان نے سوال کیا۔

"پانی!" بچوں نے نعرہ لگایا۔

"تو اس وقت پانی سے بڑا کوئی تحفہ ہو سکتا ہے بھلا!" دادی جان کی بات بچوں کی سمجھ میں آگئی تھی لیکن ننھے مانی کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔

"مگر دادی جان! تحفہ تو اچھے کاغذ میں لپیٹ کر دیا جاتا ہے۔" مانی نے کہا۔

"ہاں بیٹے! مگر کچھ تحفے اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے کسی کاغذ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے پھول، تتلی، باغ، بادل، روشنی، ہوا وغیرہ اور پانی بھی ان میں سے ایک ہے۔ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمارے لیے پانی کا انتظام کیا۔"

"اور طوطے کو بھی تو پانی چاہیے ہوتا ہے!" مانی میاں بول پڑے۔ دادی جان ہنس پڑیں۔

"پانی تمام جان دار کے لیے ضروری ہے چاہے وہ انسان ہوں، جانور ہوں یا پودے.....!"

"جبھی ابو پودے کو پانی ڈالتے ہیں۔" منیرہ نے کہا۔

ہاں! پانی تو ہر ایک کے لیے ضروری ہے....." دادی جان اتنا ہی بولی تھیں کہ امی جان جگ میں پانی اور گلاس لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"امی آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہمیں پانی چاہیے؟" آمنہ بولی۔

"میں کولر میں پانی بھر رہی تھی کہ مجھے پانی کے لیے آواز آئی تھی۔"

امی جان نے کہا تو سارے بچے ہنس پڑے کیونکہ انہیں یاد آگیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان سب نے مل کر پانی کہا تھا۔

پانی دیکھ کر سب کو پیاس لگنے لگی اور امی جان نے سب

سے پہلے پانی مانی کو دیا کیونکہ وہ سب سے چھوٹے تھے۔

"امی پانی آتا کہاں سے ہے؟" مانی نے سوال کیا۔

"پانی اللہ کی عطا کردہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو ہمیں بارش کے ذریعے ملتی ہے۔" آمنہ نے پچھلے ہفتے جو سبق یاد کیا تھا اُسے دہرایا۔

"مگر ہمارے یہاں تو پانی ٹینکر سے آتا ہے اور ابو پانی کا کین بھی لاتے ہیں؟" منیرہ نے کہا۔

"ہاں منیرہ! آپ کی بات صحیح ہے مگر پانی اصل میں بارش سے ہی آتا ہے۔" جب بارش ہوتی ہے تو پانی دریاؤں میں جاتا ہے کچھ پانی جھیلوں اور تالابوں میں جمع ہوتا ہے۔ کچھ پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ پھر یہ پانی پمپوں کے ذریعے نلوں میں آتا ہے۔ ہم ٹینکر اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ہمارے علاقے میں پانی کی کمی ہے اور چونکہ پینے کے لیے صاف ستھرا پانی چاہیے ہوتا ہے اس لئے کین لے آتے ہیں۔" امی جان نے کہا۔

"مگر چچا کے ہاں تو کنواں ہے۔" مصعب نے کہا۔

"ہاں گاؤں میں پانی کنوؤں سے ہی لیا جاتا ہے۔" دادی جان نے کہا۔

"امی جان! پانی کے چکر سے کیا مراد ہے؟" منیرہ نے سوال کیا۔

"پانی کے چکر سے مراد یہ ہے کہ دریاؤں کا پانی سورج کی روشنی سے بخارات بن کر اڑ جاتا ہے پھر یہ بخارات اُوپر جا کر بادل بناتے ہیں جب یہ بخارات ٹھنڈی جگہوں سے گزرتے ہیں تو پانی میں بدل جاتے ہیں اور بارش کی صورت میں برس جاتے ہیں۔ پھر یہ پانی کچھ تو زمین میں جذب ہوتا ہے کچھ دریاؤں سے گزرتا ہوتا سمندر میں چلا جاتا ہے اور پانی کا چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔" امی نے سوال کا جواب دیا۔

"امی صاف ستھرا پانی کیا ہوتا ہے؟" آمنہ نے سوال کیا۔

"جس پانی میں کوئی بو، رنگ یا مزہ نہ ہو لیکن جس پانی میں ان میں سے کوئی چیز شامل ہو جائے تو وہ ناخالص ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت سی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔" امی نے جواب دیا۔

"اسی لیے آپ پینے کا پانی ابالتی ہیں۔" مانی نے بڑی عقل مندی کی بات کہی۔

"ہاں اس سے جراثیم مر جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر امی فوراً کچن کی طرف چل پڑیں کیونکہ وہاں پانی ابل چکا تھا۔ ان کے ساتھ ہی آمنہ بھی اٹھ گئی اسے اسکول لے جانے کے لیے پانی کی بوتلیں دھونی تھیں۔ دادی جان عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنے چلی گئیں تو منیرہ، مصعب اور مانی اپنے اپنے پینٹ برش دھونے لگے تاکہ انہیں کل پینٹنگ کی کلاس میں صاف ستھرا برش ملے۔

☆☆

احمد شفیق، لاہور

چاند سورج سے روشنی لے کر
چلتا جائے زمین کو دے کر

گرچہ سورج کی روشنی ہے گرم
عکس اِس کا مگر ہے کتنا نرم

ہے کرشمہ نظامِ قدرت کا
یہ بھی احساں ہے ایک فطرت کا

سہہ کے سورج کی اس قدر گرمی
ہم کو دیتا ہے نور کی نرمی

روشنی لے کے جب یہ آتا ہے
منا ، ماموں اِسے بلاتا ہے

سب بڑے خوش ہوں اس کی آمد پر
عید رمضان اِس کی رویت پر

سیکھ لے یہ چلن اگر انساں
بانٹ لے دُوسروں سے دکھ خوشیاں

اطمینان اور سکون ہو پھیلا
رنج سے کوئی دل نہ ہو میلا

سرد رات اور چاندنی چٹکی
پُر سکون کتنی خامشی شب کی

کم ہیں یہ رات دیکھنے والے
کم نہیں پھر بھی اِس کے متوالے

اس میں احمد کا دل مچلتا ہے
اس پہ روشن خیال اترتا ہے

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

آزادی نمبر بہت زبردست تھا۔ (محمد وقار الحسن، حویلی لکھا)

اگست کے شمارے کا سرورق یومِ آزادی کی آمد کا احساس دلا رہا تھا، بڑے اشتیاق سے رسالہ کھولا کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ اس بار میرا خط اور کہانی ضرور شائع ہوئی ہو گی، مگر یہ کیا پورا رسالہ میرے نام سے خالی تھا۔ انکل! کیا میرا اس رسالے پر ذرا سا بھی حق نہیں۔ آپ کو بُرا لگے یا اچھا، آپ پرانے قارئین کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ (محمد سعد افراہیم، کراچی)

☆ ہمارے لیے تمام قارئین قابلِ احترام ہیں۔

تعلیم و تربیت میں ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے جسے پڑھ کر ہمیں کوئی نہ کوئی سبق ضرور حاصل ہوتا ہے۔ (حمنہ نور، پیر وال)

اگست کے شمارے کے اداریے کا پیغام بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں اندھا اعتماد، یہ کیا ہوا؟ اور غلامی بہت پسند آئیں ۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا بہت اچھا سلسلہ ہے اسے جاری رہنا چاہیے۔

(یاسر علی، لاہور)

تعلیم و تربیت میں بچوں کی اخلاقی و دینی اور تعلیمی ضروریات کا تمام مواد موجود ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا خوب صورت رسالہ شائع کرنے کا اجر دے۔ (مہوش خان، مریم خان، جھنگ صدر)

☆ آمین۔

آزادی نمبر شان دار تھا۔ "آپ بھی لکھیے" میں مختصر کہانیاں زبردست تھیں۔ یہ آپ کی لگن اور محنت کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے اتنا اچھا رسالہ ہمارے پاس بروقت پہنچتا ہے۔

(عاصم شہزاد خان، سکندر آباد)

مجھے درسِ قرآن، وحدیث کا سلسلہ بہت پسند ہے۔ میں اسے پڑھتی ہوں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

(کشف منظور، راول پنڈی)

اگست کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ رکھوالے، یہ کیا ہوا؟، پاک سرزمین شاد باد اور صلح صفائی کہانیاں اچھی تھیں۔ دماغ لڑاؤ اور بلا عنوان بہت اچھے سلسلے ہیں۔ (آمنہ رضوان، لاہور)

کہانیاں رکھوالے، بائیکاٹ اور پاک سر زمین شاد باد بہت عمدہ تھیں۔ انکل! مجھے چچا تیز گام کا شدت سے انتظار ہے۔

(مشاء محمود، گوجرانوالہ)

☆ لیجئے آپ کا انتظار ختم ہوا، چچا تیز گام اس مرتبہ آپ کے ساتھ ہیں۔

اگست کا شمارہ ہر مہینے کی طرح خوب صورت تھا۔ خاص طور پر آزادی کے متعلق تمام تحریریں بہت زبردست تھیں۔

(صدف ظفر، ملتان)

فرق تلاش کریں، دماغ لڑاؤ، کھیل دس منٹ کا اور بلا عنوان کے سلسلے بہت اچھے ہیں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ کارٹون کہانی اور شرارتی لکیریں والے سلسلے دوبارہ شروع کریں۔

(عائشہ مجید، لاہور)

انکل! اس دفعہ کہانیوں میں یہ کیا ہوا؟ اور رکھوالے زبردست تھیں۔ آپ رسالے میں زیادہ سے زیادہ کہانیاں شامل کیا کریں تاکہ رسالہ دیر سے ختم ہو ورنہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔

(اسامہ حسن، مرید کے)

ہر ماہ کی طرح اس ماہ بھی رسالہ لاجواب تھا۔ آپ نے اس مرتبہ لطائف شائع کیوں نہیں کیے؟ (محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

☆ آزادی نمبر میں جگہ کی کمی کے باعث لطائف شائع نہیں ہو سکے تھے۔ اس مرتبہ لطائف رسالے میں موجود ہیں۔

اگست کا شمارہ اچھا تھا۔ کہانیوں میں غلامی، بائیکاٹ اور رکھوالے زبردست تھیں۔ (سید محمد علی نقی، لاہور)

تعلیم وتربیت کی بدولت میری اُردو بہتر ہو گئی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا پیارا رسالہ ہمیں کام یاب زندگی گزارنے کے اصول سکھاتا ہے اور الحمد للہ ہم وہ اصول سیکھ رہے ہیں۔

(محمد عمر، ایبٹ آباد)

اگست کے شمارے میں کہانیاں غلامی اور بائیکاٹ زبردست تھیں۔

(زید احمد، لاہور)

مجھے نظم "چن بن" بہت پسند آئی۔ کہانیوں میں یہ کیا ہوا؟ صلح صفائی، اندھا اعتماد، غلامی اور رکھوالے ٹاپ پر تھیں۔

(ماہ نور، مہک، لاہور)

سلسلہ "دماغ لڑاؤ" کے سوال بہت مشکل ہوتے ہیں انکل آپ رسالے سے ہی سوالات دیا کریں۔ (ہارون الرشید، جہلم)

اگست کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تمام تحریریں بہت اچھی تھیں۔ خصوصاً غلامی، ایک سبق نیا اور بائیکاٹ لاجواب تھیں۔

(خرم اقبال، سرگودھا)

اگست کا شمارہ شان دار تھا۔ (محمد حارث جمیل، لاہور)

اگست کا شمارہ 29 جولائی کو ملا۔ کہانی غلامی نمبر ون تھی۔

(غلام صابر، اوکاڑا)

آزادی نمبر بہت اچھا تھا۔ کہانیاں غلامی، پاک سرزمین شاد باد اور اندھا اعتماد بہت اچھی لگیں۔ (علی شہروز، فیصل آباد)

اگست کے شمارے میں کہانیاں رکھوالے، غلامی، صلح صفائی، اندھا اعتماد اور نظم ۱۴ اگست ۱۹۴۷ بہت اچھی تھی۔

(حسنین افضال، سرگودھا)

اگست کا آزادی نمبر بہت اچھا تھا۔ سلسلے مفید مشغلے اور درسِ قرآن وحدیث بہت اچھے ہیں۔ مجھے کہانیوں میں غلامی، روشن دل، اندھا اعتماد، صلح صفائی اور رکھوالے بہت پسند آئیں۔

(علشبہ نورین، لاہور)

کھیل دس منٹ کا بہت مزے کا تھا اور معلومات بھی بہت اچھی تھیں۔ (عبدالرحمٰن فاروق، اوکاڑا)

میں آپ کا رسالہ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس دفعہ یہ کیا ہوا؟ کہانی سپرہٹ تھی۔ (احمد حسن، فیصل آباد)

اگست کا شمارہ بہترین تھا۔ میں نے اس سال تعلیم وتربیت پڑھنا شروع کیا ہے، کچھ ہی مہینوں میں تعلیم وتربیت نے میرا دل جیت لیا ہے۔ (فائزہ شکیل، وزیر آباد)

میں نے آپ کا رسالہ پہلی دفعہ اپریل 2010 کو پڑھا تھا۔ مجھے یہ بہت اچھا لگا۔ ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ میں یہ خط افریقہ (گھانا) سے لکھ رہی ہوں۔ (ثناء محمود، گھانا مغربی افریقہ)

انکل! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر ہم کہانیاں، لطیفے، انمول موتی اور معلومات بھیجیں تو آپ صرف ایک ہی چیز شائع کریں گے یا آپ ہماری ساری چیزیں بھی شائع کر سکتے ہیں؟

(عائشہ نور راول پنڈی)

☆ قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں تمام چیزیں باری آنے پر شائع کر دی جاتی ہیں۔

آپ کا رسالہ تعلیم، معلومات اور تربیت کے حوالے سے کسی بھی رسالے سے کم نہیں ہے۔ (عمیر خان، راول پنڈی)

میرے پسندیدہ اشعار کا سلسلہ اُردو کے مضمون میں میری بہت مدد کرتا ہے۔ کھیل دس منٹ کا اور مفید مشغلے بہت زبردست جا رہے ہیں۔ (فارحہ ظفر، رحیم یار خان)

چچا تیز گام تو بڑے تیز نکلے صرف ایک مرتبہ رسالے میں آکر رفو چکر ہو گئے۔ (مشہود حسین، پشاور)

☆ چچا تیز گام دوبارہ حاضر ہیں۔

تعلیم وتربیت بہت اچھا رسالہ ہے اور اس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ (سعدیہ وحید، ملتان)

کہانی رکھوالے میں ایک برگد کے احساسات وجذبات جان کر آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ (محمد زبیر ارشد، ملتان)

میری زندگی کے مقاصد

عبداللہ، لاہور
میں بڑا ہو کر آرمی میں جاؤں گا اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔

محمد طلحہ، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملک کا نام آسمان کی رفعتوں تک پہنچاؤں گا۔

وقاص اکرم، لاہور کینٹ
میں آرمی میں جا کر ملک کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔

برأت علی، حیدر آباد
میں پائلٹ بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

سعد حسین، لاہور
میں بڑا ہو کر کمپیوٹر انجینئر بنوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

شہروز اقبال، اسلام آباد
میں سائنس دان بن کر اپنے ملک کی ترقی کے لیے کام کروں گا۔

لیسرٹی تنویر، میاں والی
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور مستحق لوگوں کا مفت علاج کروں گی۔

رمشا نوید، اسلام آباد
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور مریضوں کا علاج کروں گی۔

سارہ ارشاد، رحیم یار خان
میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں اور اپنے والدین کا نام روشن کروں۔

محمد عزیر عظیم، لاہور
میں فوجی بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد حمزہ، لاہور
میں فوجی بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد سعید الحسن، سکھیکی منڈی
ان شاء اللہ میں ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کروں گا۔

محمد دانیال فاروق، فیصل آباد
فوجی بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا میری زندگی کا اہم مقصد ہے۔

رضوان، جھنگ
میں ڈاکٹر بن کر غریب لوگوں کا مفت علاج کروں گا۔

علی شہروز، فیصل آباد
میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ میں اچھا مسلمان اور اچھا انسان بن کر ماں باپ کا نام روشن کروں۔

احمد مجتبیٰ، راول پنڈی
میں اچھا انسان بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

عاطف نذیر، جہلم
میری زندگی کا مقصد پائلٹ بن کر ملک کی خدمت کرنا ہے۔

حافظ محمد طاہر، اوکاڑا
میں بڑا ہو کر اسلام کی تبلیغ اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

انوشہ اشتیاق، اسلام آباد
میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں گی اور ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

کاشان احمد، لاہور
میں بڑا ہو کر کمانڈو بنوں گا اور اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

عائشہ نوید، راول پنڈی
میں ٹیچر بن کر اپنے پیارے وطن کی خدمت کروں گی۔

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ..... شہر .....

مقاصد .....

.....

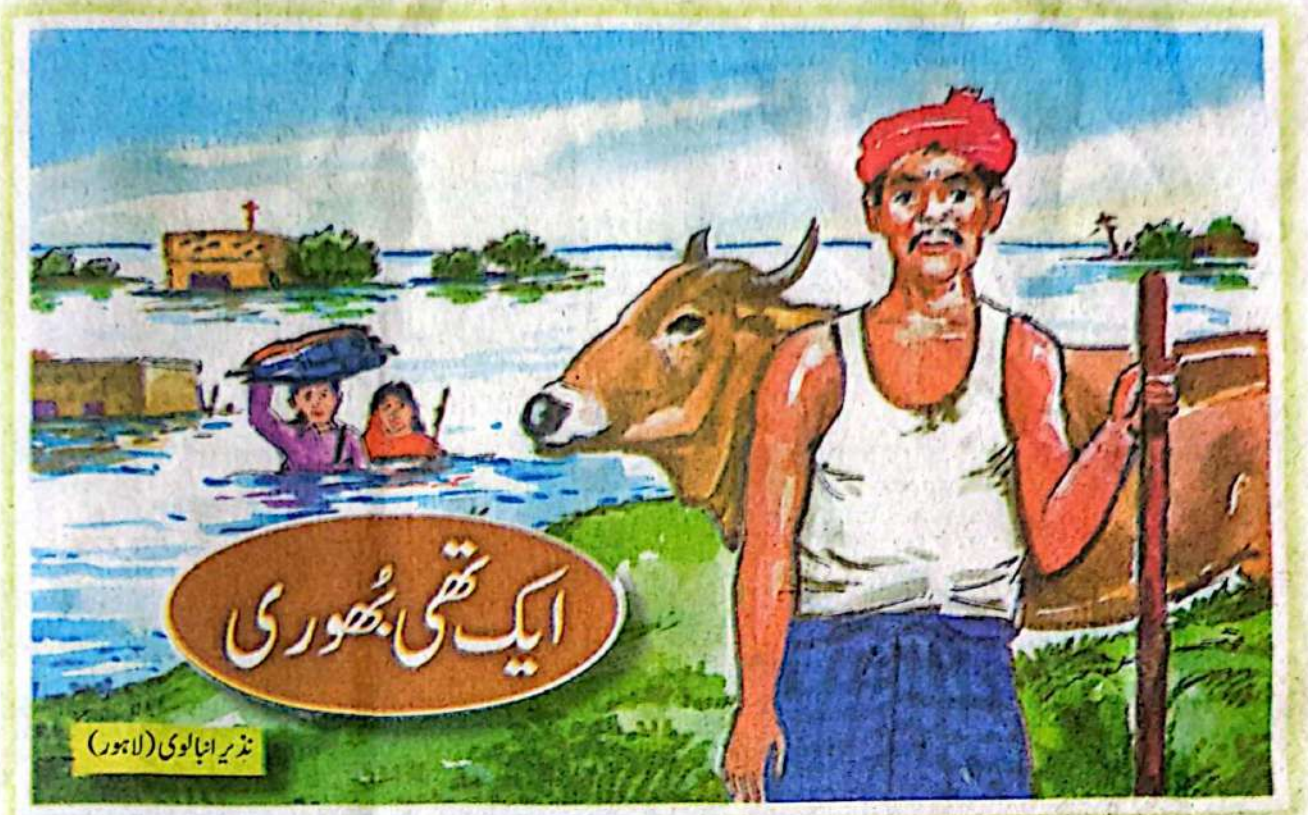

ایک تھی بُھوری

نذیر انبالوی (لاہور)

شریف کی جب آنکھ کھلی تو اُس کی پیاری بُھوری گائے کھونٹے سے بندھی سست سست سی دکھائی دے رہی تھی۔ بُھوری کے نتھنوں سے نزلہ بہہ رہا تھا۔ اُس نے رات چارا بھی بہت کم کھایا تھا۔

"میری پیاری بُھوری! اچھا تو تمہاری طبیعت خراب ہو گئی ہے، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا، ڈاکٹر جب تمہیں انجکشن لگائے گا تو تُو ٹھیک ہو جائے گی۔"

یہ سن کر گائے نے اپنے سر کو ہلایا تو شریف اُس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا:

"اچھا تو تمہیں انجکشن کی سوئی سے تکلیف ہوتی ہے، میں ڈاکٹر سے کہوں گا کہ میری پیاری بُھوری کو ذرا آرام سے انجکشن لگائے، اب تو تُو خوش ہے میری بُھوری۔"

"پھر بُھوری سے باتیں کر رہے ہو۔"

"اور کس سے باتیں کروں، کون ہے اِس گھر میں سوائے بُھوری کے۔"

شریف نے اپنے کچے گھر کے صحن میں شوکت کو دیکھ کر کہا۔

"تم تو بُھوری سے اس طرح باتیں کرتے ہو جیسے یہ تمہاری ہر بات سمجھتی ہو، یہ بے زبان تمہاری باتیں بھلا کہاں سمجھتی ہے۔"

"شوکت! اِسے بے زبان نہ کہو، یہ میری ہر بات سمجھتی ہے، میرا اِس کا ساتھ جو بہت پرانا ہے، یہ میرے لیے ہے اور میں اِس کے لئے ہوں۔" یہ کہتے ہوئے شریف کی آواز رندھ گئی تھی۔

"اچھا..... اچھا بابا مجھ سے غلطی ہوئی، یہ تمہاری ہر بات سمجھتی ہے، بھلا مجھے بھی تو پتہ چلے کہ تم اپنی بُھوری سے کیا باتیں کر رہے تھے؟"

شوکت نے شریف کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میری بُھوری کی طبیعت ٹھیک نہیں، رات تو یہ اچھی بھلی تھی اب صبح اِس کی ناک بہہ رہی ہے اور یہ بار بار کھانس بھی رہی ہے۔"

"اِس میں گھبرانے والی کوئی بات نہیں، برسات کے موسم میں جانوروں کو ایسے امراض لاحق ہو جاتے ہیں، تم نے بُھوری کا دودھ بھی دُوہا ہے یا نہیں۔"

"میں نے ابھی تک اِس کا دودھ نہیں دُوہا، میں اِس کو ست دیکھ کر سب کچھ بھول گیا تھا۔"

"اب پہلے اِس کا دودھ دُوہنا پھر اِسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا، چلو جلدی کرو۔"

شوکت کی بات سن کر شریف بُھوری کا دودھ دُوہنے لگا۔

شریف دریا کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں سکندر آباد کا رہائشی تھا۔ گاؤں کی آبادی تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ اِس گاؤں کو لوگ سکندر آباد کے ساتھ ساتھ شریف بُھوری والے کے گاؤں کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ دریا کنارے آباد ہونے کی وجہ سے جب بھی دریا میں زیادہ پانی آتا تو شہر کو بچانے کے لئے سکندر آباد کا حفاظتی بند توڑ دیا جاتا تھا۔ سیلابی پانی گاؤں میں کئی مرتبہ تباہی مچا چکا تھا۔

کئی سال پہلے شریف کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا کہ اچانک شدید بارشوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ وہ سیلاب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس سیلابی پانی میں شریف کے بیوی بچے بہہ گئے اور گھر گر گیا تھا۔ گھر میں جو چیز بچی تھی وہ صرف ایک گائے تھی، جس کو شریف اُس کی رنگت کے باعث بُھوری کہتا تھا۔ اُس دن کے بعد شریف اور بُھوری لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ شریف کی تھوڑی سی زمین تھی جس پر وہ گندم اور سبزیاں کاشت کر کے گزر بسر کرتا تھا۔ شریف صبح کے وقت بُھوری کو اپنے ساتھ کھیتوں میں لے جاتا اور اُسے ایک درخت سے باندھ کر خود کھیتی باڑی میں مصروف ہو جاتا۔ شریف کی زندگی یوں تو گاؤں تک ہی محدود تھی مگر وہ جب بھی قریبی شہر جاتا بُھوری اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔ شریف یہ سفر پیدل ہی کرتا تھا۔ وہ جہاں سے بھی گزرتا تھا لوگ اُسے دیکھ کر کہتے تھے وہ جا رہا ہے شریف بُھوری والا۔

جب کبھی بُھوری بیمار ہو جاتی تو یوں لگتا تھا جیسے بُھوری نہیں شریف بیمار ہوا ہے۔ جب کوئی بُھوری کا دودھ خریدنے کی بات کرتا تو شریف اُس سے لڑ پڑتا تھا۔ وہ بُھوری کا کچھ دودھ تو خود استعمال کرتا تھا اور باقی دودھ ایک بزرگ کی درگاہ پر غریبوں کے لئے دے آتا تھا۔ حکیم صاحب جن بچوں کے لئے گائے کا دودھ پینا تجویز کرتے تھے شریف انہیں بھی مفت دودھ دیتا تھا۔ بُھوری ہر وقت صاف ستھری ہوتی تھی۔ شریف اُس کو خود نہلاتا اور اُس کا گوبر اٹھاتا تھا۔

وہ ایک سرد رات تھی جب رات کے سناٹے میں گاؤں سے مویشی چور چار بھینس، تین گائیں اور تین بکریاں چرا کر لے گئے تھے۔ چور جو تین گائیں چرا کر لے گئے تھے اُن میں بُھوری بھی شامل تھی۔ اُس وقت سب لوگ نمبردار کی حویلی میں موجود تھے۔ شریف زار و قطار رو رہا تھا۔

"ہائے میری بُھوری، ہائے میری بُھوری۔"

"شریفے! حوصلہ کر، سب ٹھیک ہو جائے گا، بچوں کی طرح رونا دھونا بند کرو۔"

شوکت نے اُسے تسلی دی تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا:

"میں اپنی بُھوری کے بغیر زندہ نہیں رہوں گا، ہائے میری بُھوری، کوئی میری بُھوری کو ڈھونڈ لائے، میں بُھوری کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا۔"

"شریفے! اب چپ کر جا، نمبردار آگئے ہیں۔" رب نواز نے کہا۔

جب نمبردار صاحب آئے تو سبھی اُن کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ نمبردار کے اشارہ کرنے پر سب لوگ بیٹھ گئے۔

"مویشیوں کی چوری ہمارے گاؤں میں پہلی بار ہوئی ہے، میرا خیال ہے چوری کرنے والے ہمارے ہی گاؤں کے لوگ ہیں، میں نے شام کے وقت تھانے دار کو بلایا ہے، گاؤں کا کھوجی بھی اپنا کام کر رہا ہے، میں تم سب کو یقین دلاتا ہوں کہ چوروں کا جلد سراغ مل جائے گا۔ مجھے پتہ ہے سب سے زیادہ پریشان شریف ہے۔ شریف حوصلہ رکھو تمہیں تمہاری بُھوری مل جائے گی۔" نمبردار کی بات سن کر شریف بولا:

"نمبردار صاحب! ایسا ہوا تو میں سارے گاؤں میں موتی چور کے لڈو بانٹوں گا، میں بُھوری کے بغیر نامکمل ہوں، میرا گھر بُھوری کے بغیر سُونا سُونا ہے۔"

"اب تم لوگ جاؤ، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے

گا۔" نمبردار یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہو گیا۔

شریف جب گھر آیا تو بُھوری کا کھونٹا اور کھرلی دیکھ کر بے اختیار اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میری بُھوری نہ جانے کس حال میں ہو گی، اے اللہ! میری دُعا سن لے، میری بُھوری کو خیریت سے گھر بھیج دے۔"

ابھی یہ کلمات اُس کے لبوں پر ہی تھے کہ شوکت اِس کے لئے کھانا لے آیا۔

"شریف! دل چھوٹا کیوں کرتے ہو، بُھوری آجائے گی، آؤ کھانا کھالو۔"

"میرا دل کھانا کھانے کو نہیں چاہ رہا۔"

"کب تک کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"جب تک بُھوری نہیں مل جائے گی۔" شریف بولا۔

"ضد مت کرو، کھانا نہیں کھاؤ گے تو زندہ کس طرح رہو گے۔"

"بُھوری کے بغیر زندہ رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے، تم کھانا رکھ دو، جب میرا دل چاہے گا میں کھالوں گا۔"

"میرے سامنے کھانا کھاؤ، بچوں کی طرح ضد مت کرو۔" شوکت نے اتنا کہا تو شریف نے روٹی کے چند لقمے ہی کھائے اور ہاتھ کھینچ لیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بُھوری پھر رہی تھی۔ اُس کو لگ رہا تھا جیسے اُس کی بہت قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ وہ سونے کے لئے لیٹا مگر سو نہ سکا۔ اُسے کسی پل چین نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بُھوری کو دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ تھانے دار اور کھوجی اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔

وہ لمحہ شریف کے لئے بہت انمول تھا جب اُسے یہ اطلاع ملی تھی کہ شہر میں مویشی چوروں کا ایک گروہ پکڑا گیا ہے اور اُن کے قبضے سے بہت سے جانور برآمد ہوئے ہیں۔ برآمد ہونے والے جانوروں میں بُھوری بھی شامل تھی۔ نمبردار گاؤں کے لوگوں کو لے کر جانوروں کی شناخت کے لئے شہر جا پہنچا۔ شریف کی نظر جب اپنی بُھوری پر پڑی تو وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر اُس کے ماتھے کو چومنے لگا۔ بُھوری بھی اپنا سر اور دُم ہلا ہلا کر اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ شریف اور بُھوری کا ملاپ دیکھ کر وہاں پر موجود سبھی لوگ بہت خوش تھے۔ بُھوری کو پا کر شریف کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو۔ بُھوری مل جانے کی خوشی میں اُس نے بھولے حلوائی سے موتی چور کے لڈو بنوا کر پورے گاؤں میں تقسیم کیے۔ بُھوری کے آنے سے شریف کے گھر میں پھر رونق لوٹ آئی تھی۔ خوشی سے شریف کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

"ظالموں نے میری پیاری بُھوری کو لگتا ہے چارا بھی نہیں کھلایا، دو دنوں میں میری بُھوری کتنی کمزور ہو گئی ہے، لو کھاؤ ہرا ہرا چارا۔"

شریف بُھوری کو چارا کھلاتا جا رہا تھا اور اُس سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔

برسات کے موسم میں ایک دن بارش کا ایسا طوفانی سلسلہ شروع ہوا جو کئی روز تک جاری رہا۔ لوگ بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے اور بارش رکنے کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ برساتی پانی سے دریا بپھر گیا اور دریا کے قریبی بستیوں کو سیلاب کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ سکندر آباد جس دریا کے کنارے آباد تھا۔ اُس میں بھی پانی خطرے کی حد کو چھو گیا تھا۔ گاؤں کے مکینوں کو گاؤں خالی کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سیلاب نہیں آئے گا اِس لیے وہ اپنے گھر بار چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ کچھ لوگ حکم ملتے ہی گاؤں سے چل پڑے تھے۔ گاؤں چھوڑنے والوں میں شریف بھی شامل تھا۔ اُس نے اپنی بُھوری کی رسی پکڑی اور گاؤں کی حدود سے باہر نکل آیا۔ اُسی رات پانی کا ایک ریلا آیا اور حفاظتی بند کو بہا کر لے گیا۔ سیلاب سے کھڑی فصلیں تباہ اور سیلابی پانی کے سامنے گھر مٹی کے گھروندے ثابت ہوئے۔

چند دنوں بعد بارش کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جو پہلے سے بھی زیادہ شدید تھا۔ پانی جہاں جہاں سے گزر رہا تھا۔ ہر چیز

کو تباہ و برباد کرتا جا رہا تھا۔ ہر آنے والا لمحہ سیلاب زدگان کی مشکلات میں اضافہ کر رہا تھا۔ ملک کے طول و عرض میں سیلاب سے کروڑوں لوگ متاثر ہوئے تھے۔ مالی نقصان کے ساتھ ساتھ بہت سا جانی نقصان بھی ہوا تھا۔ شریف اپنی بُھوری کے ساتھ ایک کیمپ میں موجود تھا۔ یہ کیمپ ایک سکول میں بنایا گیا تھا۔ کیمپ میں ہر طرف اداسی ہی اداسی تھی۔ سب لوگ پریشان تھے۔ بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔ سیلاب سے متاثرہ لوگوں کی نظریں امداد کی متلاشی تھیں۔ ان کو نہ ہونے کے برابر امداد مل رہی تھی۔ کھانے پینے کی اشیاء کی شدید قلت تھی۔ کیمپ میں پینے کے پانی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ جب تک بُھوری دودھ دیتی رہی شریف کچھ دودھ تو خود پی لیتا اور کچھ وہاں لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا، مگر اب چارا نہ ملنے کے باعث بُھوری کا دودھ بھی سوکھ گیا تھا۔ کیمپ میں مقیم ہر شخص کی اپنی کہانی تھی۔ کوئی اپنے بیوی بچوں کو یاد کر کے رو رہا تھا تو کوئی اپنے مویشیوں کے لئے آنسو بہا رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی خاموشی سے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ شریف بھی اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ بُھوری بھی سامنے بندھی ہوئی تھی۔ بُھوری کو دیکھ کر اُس ادھیڑ عمر آدمی نے شریف سے پوچھا:

"کتنے جانور تھے تمہارے پاس؟"

"میرے پاس صرف یہی بُھوری تھی، میں سیلاب آنے سے پہلے گاؤں سے نکل آیا تھا۔ کیا تمہارے پاس بھی جانور تھے؟"

"ہاں میرے پاس پانچ بھینس تھیں جنہیں منہ زور پانی میرے آنکھوں کے سامنے بہا کر لے گیا، میں اپنی بھینسوں کو نہیں بچا سکا، میں تباہ ہو گیا ہوں، یہاں کوئی ہماری مدد کرنے کے لئے بھی نہیں آرہا، کہاں گئے سارے دولت مند، کہاں گئے سرمایہ دار؟ کوئی بھی تو نہیں آیا۔"

یہ باتیں سن کر شریف سوچنے لگا کہ اگر اُس کے پاس پیسہ ہوتا تو وہ ان مصیبت زدہ لوگوں کے آنسو پونچھتا، بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتا، مگر اس کے پاس پیسہ نہیں تھا وہ بھی سیلاب کا مارا ہوا تھا۔ اُس کے پاس صرف ایک بُھوری ہی تھی۔ اُس نے دیوار سے ٹیک لگائے بُھوری پر نظر ڈالی پھر کیمپ میں بھوک سے بلکتے بچوں کی آوازیں اُس کے کانوں میں پڑیں۔ اپنی بُھوری کو دیکھ کر وہ کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر وہ آہستگی سے بڑبڑایا:

"میں ایسا کس طرح کر سکتا ہوں، میں بُھوری کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا، میں ایسا نہیں کر سکتا۔" اِسی اثناء میں ایک فلاحی تنظیم کی طرف سے چند چاولوں کی دیگیں ایک ٹرک میں لائی

گئیں۔ دیگیں کم اور لوگ زیادہ تھے اس لیے تھوڑے تھوڑے سے چاول لوگوں کو ملے۔ لوگوں کی حالتِ زار دیکھ کر شریف نے بُھوری کو دیکھ کر ایک فیصلہ کیا، ایسا فیصلہ جو اُس کے لئے کرنا بہت مشکل تھا۔ جب ٹرک واپس جانے لگا تو شریف نے ٹرک ڈرائیور سے کہا:

"میں اپنی گائے کو شہر لے جانا چاہتا ہوں، کتنا کرایہ لو گے؟"

کچھ دیر بعد شریف اور ٹرک ڈرائیور میں معاملہ طے پا گیا۔ دو گھنٹے بعد شریف اپنی بُھوری کے ساتھ مویشی منڈی میں موجود تھا۔ بُھوری کی رسی شریف کے ہاتھ میں تھی۔ منڈی میں جانوروں کا بھاؤ تاؤ جاری تھا۔ ایک بیوپاری نے بُھوری کو دیکھتے ہوئے شریف سے پوچھا:

"ہاں بھئی کیا قیمت مانگتے ہو؟"

"جو قیمت مناسب ہے دے دیں۔" شریف یہ جملہ مشکل سے کہہ پایا۔

"یہ گائے اپنی ہے یا کہیں سے ....."

"نہیں بھائی! یہ میری بُھوری ہے، میری پیاری بُھوری۔"

"اچھا تو یہ بُھوری ہے بُھوری، بولو کیا لو گے بُھوری کا؟" بیوپاری نے پوچھا۔

"ستر ہزار روپے۔" شریف بولا۔

آخر دونوں کے درمیان ساٹھ ہزار روپے میں سودا ہو گیا۔ بیوپاری نے روپے گن کر شریف کو تھما دیے اور بُھوری کی رسی خود پکڑ لی۔

"اوئے بالے! اِدھر آ، لے گائے کو اندر باندھ آ۔" بیوپاری نے آواز لگائی تو ایک نوجوان بھاگ کر آیا اور بُھوری کی رسی پکڑ کر چار دیواری کے اندر لے جانے لگا تو بُھوری مسلسل بولنے لگی۔ وہ بار بار شریف کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نوجوان نے بُھوری کی رسی زور سے کھینچی تو شریف فوراً بولا:

"ذرا آرام سے، میری پیاری بُھوری کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

پھر اگلے ہی لمحے شریف کو احساس ہوا کہ بُھوری اب اُس کی ملکیت نہیں رہی۔ بُھوری پیچھے مڑ مڑ کر شریف کو دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ اُسے یہاں کیوں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ شریف اب بے بس تھا، بیوپاری کے دیئے روپے اب اُس کے ہاتھ میں تھے۔

شریف نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ روپے گنے اور تہ بند کی ڈب میں رکھ لیے۔ اتنی دیر میں بُھوری چار دیواری میں داخل ہو چکی تھی۔ شریف بھاگ کر چار دیواری کے دروازے کے پاس جا کر رک گیا۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی بُھوری کا آخری دیدار کرتا۔ وہ وہاں سے تیزی سے بازار کی طرف گیا اور کھانے پینے کی بہت سی چیزیں ٹرک میں لاد کر کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ کھانے پینے کی اشیاء لے کر کیمپ میں پہنچا تو بھوکے پیاسے لوگ ٹرک کی طرف بڑھے۔ ٹرک میں موجود کھانے پینے کی چیزیں کیمپ میں مقیم سیلاب زدگان کے لئے دو تین دنوں کے لئے کافی تھیں۔ کھانا ملنے کے بعد شریف کو بلکتے بچوں کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ بہت مطمئن تھا کیوں کہ وہ اُن لوگوں میں شامل نہیں تھا جنہوں نے استطاعت رکھتے ہوئے بھی سیلاب زدگان کی مدد نہیں کی تھی۔

رات کے وقت وہ دیوار سے ٹیک لگائے اُس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں اُس کی پیاری بُھوری صبح تک بندھی ہوئی تھی۔ اب بُھوری وہاں نہیں تھی۔ اپنی بُھوری کو یاد کرتے ہوئے شریف نے اپنے ہاتھ دُعا کے لئے اٹھا دیئے:

"اے اللہ! میں نے اپنی سب سے پیاری چیز تیرے رستے میں خیرات کر دی ہے، اے میرے رب میری پیاری بُھوری کے صدقے میں سیلاب کی آفت ٹال دے، میری یہ معمولی سی خیرات قبول کر لے، میری بُھوری کے صدقے میں اپنا کرم کر دے۔" یہ کہتے ہوئے شریف کی آواز ابھر اگئی اور کیمپ کے سناٹے میں یہ آواز دُور تک سنائی دینے لگی۔

---☆☆☆---

ہونہار مصور

عید کارڈ

تصاویر صرف اُلٹی رخ میں ہی بھیجیں

سامعہ خالد، شکر گڑھ (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

طلحہ صفی، چکوال (دُوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

آسیہ نواز، بھلوال (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

صدف ظفر، ملتان (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

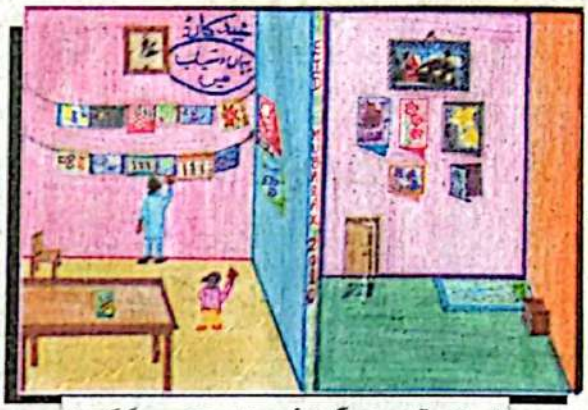

حسن ذکاء، قلعہ دیدار سنگھ (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

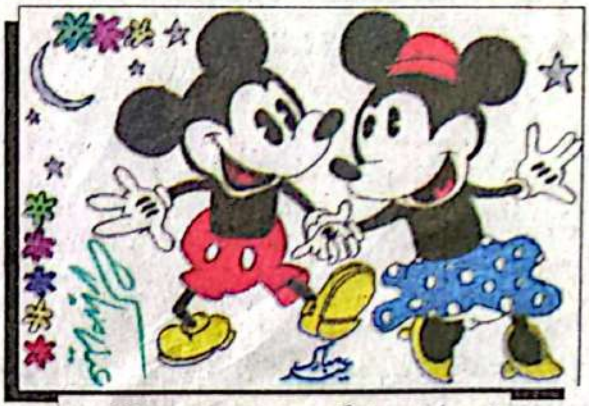

افراسیاب ملانہ، مظفر گڑھ (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: عامر فضل حسین حویلیاں۔ محمد سعد افرایم کراچی۔ ماہ نور فاروق اوکاڑا۔ بہشرہ شاہد فیصل آباد۔ فرہ عابد لاہور۔ ریحام عبدالعلیم کراچی۔ سعدیہ نورین بھکر۔ امیہ خان، محمد عثمان ہری پور ہزارہ۔ غلام صابر اوکاڑا۔ حورالعین ملانہ مظفر گڑھ۔ بادیہ سمیع خان ڈیرہ غازی خان۔ عائشہ آبرو راول پنڈی۔ سید حسین افتخار، سید علی افتخار، مریم ندیم صدیقی لاہور۔ آمنہ مظہر، مریم مظہر راول پنڈی۔ عیشاء فاطمہ لاہور۔ آمنہ شاہد اسلام آباد۔ حجاب اجمل فیصل آباد۔ زنیرہ جاوید گوجرانوالہ۔ عیشہ کمل لاہور۔ اسامہ بن حسن مرید کے۔ زینب عبدالخالق کراچی۔ عائشہ، مومنہ بشارت راول پنڈی۔ آصف اشرف، محمد شہزاد فاروق بہاول پور۔ ابجد زیدی خانیوال۔ رحما سعدیہ قلعہ دیدار سنگھ۔ افراح عبدالعلیم کراچی۔ مریم خان جھنگ۔ فخر زمان سیال میلسی۔ خدیجہ شیخ حفظہ رمضان، عائشہ شیخ راول پنڈی۔ سلمٰی صفی چکوال۔ تیمور الرحمان ملانہ مظفر گڑھ۔ انس نسیم خان کراچی۔ سنابل بابر لاہور۔ ثناء جمال اسلام آباد۔ احمد مظہر خانیوال۔ محسن علی رضا لاہور۔ خرم شہزاد اوکاڑا۔ نورالعین، عروج فاطمہ لاہور۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 ستمبر

اکتوبر کا موضوع: پھولوں کی دکان

آخری تاریخ 8 اکتوبر

نومبر کا موضوع: کمپیوٹر

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 ستمبر 2010ء ہے۔

اگست 2010ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو 200 عنوانات پسند آئے اور یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی کتب کے انعامات کے حق دار قرار پائے۔

☆ اسامہ بن حسن، مرید کے (ویلکم ٹو لکی ایرانی سائیکل سرکس)
☆ دُرِنایاب زہرا، سرگودھا (عقل بڑی یا سائیکل)
☆ عمارہ شکیل، وزیر آباد (چھوٹے چچا تیز گام)
☆ ثمین فاطمہ، اسلام آباد (ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا)
☆ اُسامہ افتخار بٹ، گجرات (واہ! کیا ایڈونچر ہے)

معیاری کتابیں

دل چسپ سائنسی معلومات

کئی سوال کئی جواب

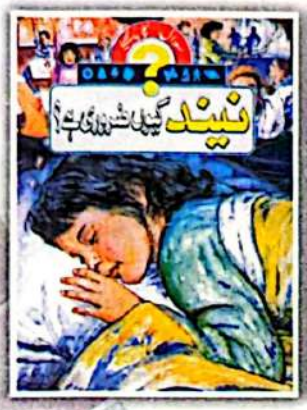

- دیکھنا کیا ہے؟
- سُونگھنا اور چکھنا کیا ہے؟
- سننا کیا ہے؟
- ستارے کیوں ٹمٹماتے ہیں؟
- موسم کیوں بدلتے ہیں؟
- آواز کیا ہے؟
- ہَوا کیا ہے؟
- نیند کیوں ضروری ہے؟

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
CPL NO. 123 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES

Shezan

Pakistan's Favourite
Tomato Ketchup!